مقدمہ میں سورۂ نور کی اہمیت اور اس کے نزول کا پس منظر بیان کیا ہے، اور اس کے مضامین کا تجزیہ کرکے ان کی تشریح کی ہے، لائق محقق نے مطبوعہ نسخہ کے بعض اغلاط کی تصحیح بھی کی ہے، اور آخر میں مراجع و مضامین کی دو فہرستیں دی ہیں، حسن طباعت کے لیے الدار السلفیۃ اور اس کے سربراہ مولانا مختار احمد ندوی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

الجامع لشعب الإیمان (الجزء السادس)

تالیف امام حافظ ابوبکر احمد بن حسین بیہقی، تقطیع کلاں، کاغذ و طباعت عمدہ

صفحات ۵۷۶، مجلد پتہ: ایضاً۔

اس کتاب کی ابتدائی چند جلدوں کا ذکر ان صفحات میں پہلے آچکا ہے، یہ اس کا چھٹا حصہ ہے جس کو پہلے حصوں کی طرح بہت نفاست اور خوبصورتی سے شائع کیا گیا ہے، اس حصہ میں امام بیہقیؒ نے ایمان کے ستر سے زائد شعبوں میں سے بیسویں، اکیسویں اور بائیسویں شعبوں کا ذکر کیا ہے جو بالترتیب طہارت، صلوٰۃ اور زکوٰۃ کے ابواب پر مشتمل ہیں، کتاب کے متن کی تصحیح و مراجعت آیات و احادیث کی تخریج اور تحقیق و تحشیہ کا کام ڈاکٹر عبدالعلی نے محنت و جستجو سے انجام دیا ہے، اس کے لیے اہل علم کو ان کا اور حسن طباعت کے لیے مولانا مختار احمد ندوی کا ممنون ہونا چاہیے۔

تذکرۂ مشاہیر کوپاگنج: مرتبہ مولانا محمد عثمان معروفی اعظمی و ابوالکلام جوہر ندوی صاحبان، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۶۰، پتہ محمد عثمان معروفی مدرسہ جامع العلوم کوپاگنج اعظم گڈھ

اعظم گڈھ کے قصبات مردم خیزی کے لیے ہمیشہ سے ممتاز رہے ہیں، کوپاگنج بھی اعظم گڈھ کا ایک مشہور صنعتی قصبہ ہے، اس کتاب میں اس کے اور اس کے قرب و جوار کے مختلف مذاہب کے تقریباً چالیس علماء و مشائخ کے مختصر حالات تحریر کیے گئے ہیں، شروع میں قصبہ کی مختصر تاریخ بھی قلمبند کی گئی ہے جس میں یہاں کی مساجد، مدارس اور دوسری تاریخی اور متبرک جگہوں کا ذکر ہے۔

"ض"

جلد ۱۴۲ ماہ ربیع الثانی ۱۴۰۹ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۸۸ء عدد ۵

مضامین

شذرات

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی صدسالہ تقریبات کا آغاز ۱۱ر نومبر ۸۸ء کو وگیان بھون نئی دہلی میں ہونے والے جلسہ سے ہوا، اس کا افتتاح صدر جمہوریۂ ہند مسٹر آر وینکٹ رمن نے کیا، نائب صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما، وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی، مرکزی وزراء اور مختلف سیاسی پارٹیوں کے رہنما بھی اس تقریب میں شریک تھے، اس موقع پر مولانا کو خراج تحسین پیش کیا گیا، اور ان کی یاد میں ٹکٹ بھی جاری کیا گیا، پورے ملک سے مولانا کی صدسالہ تقریبات منائے جانے کی خبریں آرہی ہیں، بلاشبہ وہ اپنی بے لوث خدمت و قربانی کی وجہ سے ہر اعزاز اور قدر دانی کے مستحق ہیں۔

مولانا آزاد بڑی قد آور اور ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے، قدرت نے ان کی ذات میں جو گوناگوں کمالات اور مختلف النوع خصوصیات جمع کردی تھیں، ان کا ظہور کسی ایک ہی شخصیت میں نادر الوجود ہے، مذہب و سیاست، علم و فن اور ادب و صحافت کا میدان ان کے زریں اور لازوال کارناموں سے ہمیشہ جگمگاتا رہے گا، قوم کی ذہنی تربیت، ملک کی آزادی، ہندوستانی قومیت کے استحکام اور فرقہ وارانہ اتحاد و ہم آہنگی کے لیے ان کی زندگی وقف رہی اور اس کے لیے انھوں نے ناقابل فراموش قربانی بھی دی، وہ عزم و استقلال کا پہاڑ تھے، اس لیے ابتدا میں انھوں نے جو راہ اختیار کی، اس سے تمام عمر سرمو انحراف نہیں کیا، حالانکہ اس طویل مدت میں بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے، جن کی وجہ سے اچھے اچھے لوگوں کے قدم ڈگمگا گئے اور خود مولانا کے رفقائے کار نے فکر و عمل کی نئی راہیں تلاش کرلیں، مگر انھوں نے اپنے اختیار کیے ہوئے راستہ سے منھ نہ موڑا، بالآخر ۴۷ء کے بعد کے واقعات نے مولانا کی بصیرت، ہوش مندی، فہم و فراست اور اصابت رائے پر مہر تصدیق ثبت کردی۔

مولانا جیسا نکتہ داں، دانائے راز، حکیم، مدبر، عالی دماغ اور عہد آفریں انسان کہیں مدتوں میں پیدا ہوتا ہے، جس کی تحریر و تقریر بجلی بن کر ایوان باطل کو تاراج کردیتی ہے، اور جو اپنی جادو بیانی اور سحر طراز قلم سے بے حس و حرکت قوم کو حرکت و عمل پر آمادہ کردیتا ہے، جس کی مسیحا نفسی اور اعجاز پروری مردہ دلوں میں زندگی کی روح پھونک دیتی ہے، جس کی روشن ضمیری اور نور بصیرت تاریک دماغوں کو منور اور علم و معرفت کے تمام گوشوں کو روشن کردیتا ہے، جو اپنا راستہ سب سے الگ نکالتا ہے، اور اپنے عہد و ماحول کو متاثر کرکے لوگوں کو فرسودہ روایات اور تقلیدی بندشوں سے آزاد کراتا ہے، قوموں کے افکار و تصورات اور ملتوں کے خیالات و نظریات میں انقلاب پیدا کرکے تاریخ کا نیا دور شروع کرتا ہے، اور ترقی و تعمیر کی راہوں میں اپنا نقش پا رہنمائی کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد ایک سچے اور پکے مسلمان تھے، اس لیے انھیں اپنی تاریخ و تہذیب، اپنے علوم و فنون اور اسلام کے عقائد و تعلیمات نہایت عزیز تھیں، اور وہ بڑے فخر سے ان کو اپنا ورثہ اور اپنی دولت کا سرمایہ سمجھتے تھے، جس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع نہ ہونے دینا چاہتے تھے، اور نہ اس میں کسی مداخلت کو برداشت کرسکتے تھے، مگر اسی کے ساتھ وہ بڑے محب وطن ہندوستانی، جنگ آزادی کے میر کارواں اور آزاد ہندوستان کے معمار اعظم تھے، اس لیے ان کی ذات میں مذہب و وطنیت اور دین و سیاست کا بڑا دلکش امتزاج تھا، انھوں نے ان متضاد عناصر کو ایک دوسرے سے متصادم ہونے کے بجائے ہم آہنگ کردیا تھا، اور وہ اپنے کو ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا عنصر اور ناقابل تقسیم ہندوستانی قوم کا جز مانتے تھے۔

مولانا فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور ہندو مسلم اتحاد کو قومی جدوجہد کی اصل بنیاد اور کانگریس کی سرگرمیوں کا حاصل سمجھتے تھے، انھوں نے ۱۵ر دسمبر ۲۳ء کو دہلی میں ہونے والے انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس خصوصی کا خطبۂ صدارت دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ "ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ہمیں قومی آزادی نہیں مل سکتی، بلکہ اس کے بغیر ہم انسانیت کے ابتدائی اصول بھی اپنے اندر نہیں پیدا کرسکتے، آج اگر ایک

فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اتر آئے، اور قطب مینار پر کھڑے ہوکر یہ اعلان کر دے کہ سوراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے، بشرطیکہ ہندو مسلم اتحاد سے دستبردار ہو جائیے، تو میں سوراج سے دستبردار ہو جاؤں گا، مگر اس سے دستبردار نہ ہوں گا، کیونکہ اگر سوراج میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا، لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے"۔ مولانا کا یہ اتحاد پرور پیغام قومی رہنماؤں اور حکومت کے ذمہ داروں کو ملک میں بڑھتی ہوئی فرقہ وارانہ کشیدگی کے بارے میں سنجیدگی سے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، قومی یکجہتی کونسل، اقلیتی کمیشن اور ۱۵ و ۲۰ نکاتی پروگرام کے باوجود ملک میں درندگی اور خوں ریزی کا سلسلہ جاری ہے، ایک گروہ دوسرے گروہ کے ساتھ تشدد پر آمادہ ہے، اور بڑی مچھلیوں کی طرح یہ چھوٹی مچھلیوں کو نگل جانا چاہتا ہے۔

دوسرا مسئلہ مولانا کی محبوب زبان اردو کا ہے، جو آزادی ملنے کے بعد ہی سے تعصب اور تنگ نظری کا شکار ہے، چند ماہ قبل حکومت ہند نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کو یونیورسٹی کا درجہ دینے کے لیے جو بل منظور کیا ہے، اس میں منجملہ اور باتوں کے اردو ذریعۂ تعلیم کو ختم کر دیا گیا ہے جو علی گڑھ سے علٰحدگی اور جامعہ کے قیام کا ایک بنیادی مقصد تھا، مگر ہماری سیکولر حکومت کی طبع نازک پر یہ بھی گراں تھا، آزادی ملنے کے ساتھ ہی وہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کو ختم کر چکی تھی، اور اب وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ساتھ بھی یہی سلوک کرنا چاہتی ہے، اردو والے ملک میں اردو یونیورسٹی کا مطالبہ کر رہے ہیں، اور حکومت بنی بنائی یونیورسٹیوں سے اردو کا نام و نشان مٹانا چاہتی ہے، اگر مولانا آزاد سے عقیدت و محبت کا اظہار محض زبانی نہیں ہے، تو حکومت کو مولانا کی زبان کے معاملہ میں فراخ دلی کا رویہ اختیار کرنا اور اردو کو اس کا جائز اور آئینی حق دینا ہوگا۔

مقالات

گل رعنا

(شعرائے اردو کا ایک مشہور و مقبول تذکرہ)

از

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

"آب حیات (مولوی محمد حسین آزاد مرحوم) کے بعد اور جدید ادبی و تنقیدی دور سے پہلے گل رعنا (مولانا حکیم سید عبدالحیؒ مرحوم) اور شعر الہند (مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم) کے نام سے اردو کے دو اہم اور مستند تذکرے مرتب کیے گئے، ان کے بارے میں جدید نقاد جو بھی کہیں مگر ملک کا ادبی ذہن بنانے اور اچھا اور عمدہ ذوق پیدا کرنے میں ان دونوں کتابوں کا بڑا حصہ رہا ہے، یہ حسن اتفاق ہے کہ ان دونوں کی اشاعت کا سہرا دارالمصنفین کے سر رہا، اور یہ اس کی بہت مقبول تصنیفات میں ہیں۔

گل رعنا کے فاضل مصنف مولانا حکیم سید عبدالحیؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی نظر اسلامی ہند کی علمی و ادبی تاریخ پر بہت وسیع اور گہری تھی، ان کا اردو شعر و سخن کا بھی ذوق سلیم تھا، اور وہ بڑی رواں، سلیس، سادہ اور شستہ زبان لکھتے تھے جس کا نمونہ گل رعنا بھی ہے، ان کے خلف الرشید مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے، انھوں نے یہ فاضلانہ مقالہ گل رعنا کے

نئے اڈیشن کے دیباچہ کے طور پر لکھا تھا جو عنقریب شائع ہوگا، اس میں اصلاً تصنیف کی کہانی سنائی گئی ہے، لیکن شروع میں ہندوستان کے قدیم طرز تعلیم کی نتیجہ خیزی اور گل رعنا کی تصنیف کی ضرورت واسباب کے تحت، جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں آب حیات کی فروگذاشتوں کی نشاندہی کے علاوہ گوناگوں مفید معلومات، اہم اور دلچسپ ادبی حقائق بھی بیان کیے گئے ہیں، جن سے واقفیت اردو زبان کے طالب علموں کے لیے ضروری ہے، اسی خیال سے مناسب معلوم ہوا کہ یہ پہلے معارف کے قارئین کی نظر سے گذر جائے، امید ہے کہ وہ اس کو پڑھ کر لطف اندوز ہوں گے" (معارف)

ہندوستان[1] میں انگریزوں کے اقتدار اور جدید نظام تعلیم کے رائج ہونے سے پہلے ایک ہی نظام تعلیم رائج تھا، جو فارسی و عربی درسیات، زبان کے قواعد، ریاضی، منطق و فلسفہ، ادب (نثر و نظم) بلاغت وفن عروض سے لیکر علوم دینیہ (فقہ، اصول و حدیث و تفسیر و علم کلام) پر مشتمل تھا، صدیوں تک ہندوستان میں ذہنی صلاحیتوں کے نشوونما، فطری جوہر و ملکات کے چمکانے اور اعلیٰ ثقافت (کلچر) پیدا کرنے کا یہی واحد ذریعہ تھا، جس سے ملک کی انتظامیہ کے لیے اعلیٰ عہدہ دار، یہاں تک کہ وزیر سلطنت، محاسب اعلیٰ (اکاؤنٹنٹ جنرل) جس کو عہد قدیم میں "مستوفی الممالک" کے نام سے یاد کرتے تھے، دبیر و منشی (انشاپرداز و سکریٹری) اور قاضی و مفتی یکساں طور پر پیدا ہوتے تھے، مستوفی الممالک مولانا شمس الدین خوارزمی (صدر و محاسب اعلیٰ بعہد غیاث الدین بلبن) خواجہ جہاں محمود گاواں گیلانی وزیر سلطنت بیدر دکن، جملۃ الملک سعد اللہ خان علامی وزیر شاہجہاں بادشاہ اور تفضل حسین خان علامہ وزیر سلطنت اودھ کے نام بطور نمونہ پیش کیے جا سکتے ہیں، جو سب اسی دور کی یادگار اور اسی طرز تعلیم کا نتیجہ تھے۔

اس عہد میں جس طرح ہر طرح کے باصلاحیت تعلیم یافتہ افراد پیدا کرنے کے لیے جو ہر طرح کی ذمہ داری سنبھال سکیں کوئی اور ذریعہ تعلیم اختیار نہیں کیا جاتا تھا، اسی طرح ادب و انشاء، تحریر

[1] یہ اگرچہ معارف اکتوبر ۱۹۶۶ء میں چھپ چکا ہے، لیکن تذکرہ کے طور پر جب کہ گل رعنا کا دوسرا ایڈیشن [illegible]

و تصنیف، نقد سخن اور شاعری اور سخن سنجی کا مذاق اور سلیقہ پیدا کرنے کے لیے بھی کوئی متوازی نظام تعلیم یا اختصاص پیدا کرنے کا کوئی شعبہ موجود نہ تھا، جس طالب علم میں جس فن کی فطری صلاحیت اور خداداد مناسبت ہوتی تھی یا اس کے مخصوص محرکات جمع ہو جاتے تھے، وہ اس میں امتیاز و اختصاص پیدا کر لیتا تھا، اور اس کو اپنی زندگی کا مشغلہ بنا لیتا تھا، فارسی ادبیات کا اتنا وافر حصہ اور اس کے ایسے دلکش و دلآویز نمونے نصاب تعلیم میں داخل تھے، اور بالعموم اساتذہ ان کو ایسی دلچسپی و دل سوزی سے پڑھاتے تھے[1] کہ بجز ان لوگوں کے جو فطری طور پر ذوق اور ادبی صلاحیت سے محروم ہوتے تھے، عام طور پر فارسی کا ذوق اور شعر و ادب سے لطف لینے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی، اور چونکہ فارسی اور اردو کا گہرا تعلق ہے اس لیے اردو میں بھی اس سے بیش قیمت مدد ملتی تھی، اس زمانہ میں نصاب تعلیم، زندگی، ملک کی زبان و ادب اور مجالس و معاشرت سے الگ تھلگ کوئی چیز نہ تھی، جیسا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے واضح طریقہ پر نظر آنے لگا، یہی باکمال اساتذہ جو مسند درس پر بیٹھ کر منطق و فلسفہ کی خشک و بے مزہ کتابیں پڑھاتے تھے، اور علمی مباحث اور دقیق مضامین میں بال کی کھال نکالتے تھے، اور حدیث و تفسیر کے درس کے وقت وقار و تمکنت کی تصویر ہوتے، دوسرے وقت اپنے شہر و قریہ کی ادبی مجلسوں میں بے تکلف شریک ہوتے، اچھے شعر کی دل کھول کر داد دیتے، خود بھی طبع آزمائی کرتے اور شعر کا کھرا کھوٹا خوب پرکھتے، بلکہ اکثر اوقات ان ہی کا قول اس بارے میں قول فیصل ہوتا، مولوی محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اپنے استاذ ذوق کے حالات میں لکھا ہے کہ ذوق نے اپنے

[1] عربی کے مقابلہ میں فارسی ادبیات کے نمونے اور اس کی نظم و نثر کا انتخاب بہتر تھا، اس لیے اس نصاب سے فارسی کا جتنا اچھا مذاق پیدا ہوتا تھا اور اس میں انشاء و تحریر کی جو صلاحیت پیدا ہوتی تھی وہ عربی میں عام طور پر مفقود تھی۔

استاد شاہ نصیر کی غزل پر غزل لکھی:

"شاہ صاحب کی طرف سے بجائے خود اس پر اعتراض ہوئے، جشن قریب تھا، شیخ علیہ الرحمہ نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ اس طرح میں لکھا، اگر پہلے مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس لے گئے، کہ اس کے صحت وسقم سے آگاہ فرمائیں، انھوں نے سن کر پڑھنے کی اجازت دی، مگر ولی عہد بہادر نے اپنے شقہ کے ساتھ اسے پھر شاہ صاحب کے پاس بھیجا، انھوں نے جو کچھ کہا تھا وہی جواب میں لکھ دیا، اور یہ شعر بھی لکھا ؎

بود گفتۂ من حرف اعتراض چنال — کسے بدیدۂ بینا فرو برد انگشت

شیخ مرحوم کا دل اور بھی قوی ہوگیا اور دربار شاہی میں جاکر قصیدہ سنایا۔"[1]

۱۸۵۷ء اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک جب تک ملک میں نیا نظام تعلیم رائج و مقبول نہیں ہوا تھا، ادبی و علمی محفلوں میں اسی قدیم نصاب کے ساختہ و پرداختہ فضلاء صدر نشین ہوتے، وہی زبان و ادب کی اس ملک میں سربراہی اور رہنمائی کا فرض انجام دیتے، ان ہی کا قول ان اصناف میں حجت مانا جاتا، ان ہی کے قلم سے ان مباحث پر بلند پایہ تصنیفات نکلتیں، اس لیے کہ پورے ملک میں بھی سب سے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ تھا، ۱۸۵۷ء سے پہلے اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک بھی مولوی امام بخش صہبائی، مولانا عبداللہ خان علوی، مفتی صدرالدین خان آزردہ اور مولانا فضل حق خیرآبادی، جس طرح علوم معقول و منقول میں اپنے دور کے امام مانے جاتے تھے، اسی طرح نکتہ شناسی، دیدہ وری و سخن فہمی میں بھی معیار تسلیم کیے جاتے تھے، اور ان کا قول حرف آخر اور زبان و ادب کے بارہ میں بھی "فتویٰ"

[1] آب حیات مطبع کریمی لاہور ص ۳۵۴۔

کی حیثیت رکھتا تھا، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ جن کی سخن فہمی اور نکتہ رسی ان کے دور میں ایک ایسی حقیقت بن گئی تھی کہ غالب تک کو یہ کہنا پڑا ؎

غالب بہ فن گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او — ننوشت در دیواں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

اسی نظام تعلیم کے فیض یافتہ و پروردہ تھے، مولانا فضل حق خیرآبادی جو اس دور آخر میں علوم عقلیہ کے امام مانے جاتے ہیں اور جن کا سارا وقت منطق و فلسفہ کی اعلیٰ کتابوں کے درس و تدریس اور ان کی موشگافیوں میں گذرتا تھا اس پایہ کے سخن فہم و سخن شناس تھے کہ غالب نے ان کی خاطر اپنے اشعار (جو شاعر کے لیے اولاد کی طرح عزیز ہوتے ہیں) کے ایک بڑے حصہ پر خط نسخ پھیر دیا، مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "مولانا کی تحریک سے مرزا نے اپنے کلام سے دو ثلث کے قریب اشعار نکال ڈالے اور اس کے بعد اس روش پر چلنا چھوڑ دیا۔"[1]

اس دور کے بعد بھی اسی طبقہ کے ہاتھ میں ملک کی علمی و ادبی قیادت رہی، مولوی محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی اور علامہ شبلی نعمانی جن کو دور آخر میں زبان و ادب کی عمارت کے چار ستون کہنا بجا ہوگا اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے، اور ان ہی کے قلم سے آب حیات، مقدمۂ شعر و شاعری اور موازنۂ انیس و دبیر جیسی معرکۃ الآرا ادبی کتابیں نکلیں

مولانا حکیم سید عبدالحی اسی دور واپسیں کی آخری یادگاروں میں تھے، انھوں نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا اس میں گھر گھر شعر و سخن کے چرچے تھے، شہروں کو چھوڑ کر جہاں مشاعرہ لازمۂ تمدن بن گیا تھا، قصبات اور بڑے دیہاتوں میں بھی مشاعرہ کی محفلیں آراستہ ہوتیں، اور نوجوان تو نوجوان بچے تک شعر موزوں کرنے کی کوشش کرتے، ان کے والد مولوی سید فخر الدین صاحب خیالی، پُرفکر شاعر اور کہنہ مشق نثار و ادیب تھے، مولانا سید عبدالحی

[1] یادگار غالب۔

جب لکھنؤ میں تحصیل علم میں مشغول تھے، اس وقت منشی امیر احمد امیرؔ مینائی، حکیم ضامن علی جلالؔ، شیخ امیر اللہ تسلیمؔ اور مولوی محمد محسن محسنؔ کاکوروی کی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی ان میں سے بعض اساتذۂ سخن اگرچہ دربار رام پور سے متعلق ہو گئے تھے، لیکن وطنیت کے تعلق سے لکھنؤ کے در و دیوار ان کے اشعار کی تعریف و تحسین کے شور سے گونج رہے تھے، اور بچہ بچہ کی زبان پر ان کا نام اور کلام تھا، ادھر مرزا سلامت علی دبیرؔ اور میر ببر علی انیسؔ کے مراثی کی دھوم مچی ہوئی تھی، اور سارا شہر ان کے کلام سے مست ہو رہا تھا، وہ خود درد مند دل اور موزوں طبیعت لے کر آئے تھے، اردو تو ان کی زبان تھی، عربی و فارسی ادب و زبان سے ان کو فطری مناسبت تھی، بھوپال گئے تو وہاں بھی والا جاہ نواب سید صدیق حسن خان بہادر (جو مفتی صدر الدین خان آزردہ کے عزیز شاگرد تھے) کی جوہر شناسی اور قدر دانی سے شہر باکمال و صاحب ذوق علماء و ادباء کا مرکز بنا ہوا تھا، اور افتخار الشعراء حافظ محمد خان شہیرؔ، غلام احمد فروغیؔ اور متعدد نامی گرامی شعراء موجود تھے، اس ماحول اور اس انداز تعلیم و تربیت میں شعر و سخن کا ذوق سلیم اور سخن فہمی کا مذاق صحیح پیدا نہ ہوتا تعجب ہے، چنانچہ یہ مذاق نہ صرف یہ کہ پیدا ہوا، بلکہ اس نے اس حد تک ترقی کی کہ ان کے قلم سے اردو شعراء کا ایک تذکرہ مرتب ہوا، جو ان کی زندگی کے بعد "گل رعنا" کے نام سے شایع ہوا۔

شعرائے اردو کے تذکرے | ہندوستان میں ترکی و افغانی النسل فاتحین اور حکمرانوں کے اثر سے فارسی ہی تصنیفی و دفتری زبان قرار پائی، اور ۱۸۵۷ء کے کچھ بعد تک ہر قسم کا سنجیدہ علمی و تحریری کام یہاں تک کہ مراسلت، باپ بیٹوں اور دوستوں کی خط و کتابت بھی بالعموم اسی زبان میں ہوتی تھی، اس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ اردو شعراء کے تذکرے ۱۸۵۷ء تک فارسی ہی میں لکھے گئے، یہ سب تذکرے اردو شاعری کے خط و خال اس کی

زبان کے نکتوں، اشعار کی نوک پلک اور شعراء کی امتیازی خصوصیات اور ان کے طرز کلام کو ظاہر کرنے کے لیے لکھے گئے، اور ان میں تمام تر ان کے اردو کلام کا نمونہ ہی پیش کیا گیا ہے، لیکن تذکروں کی زبان فارسی ہی ہے، چنانچہ میر تقی کی نکات الشعراء، میر حسن اور مصحفیؔ کے تذکرے، مولوی قدرت اللہ کا طبقات الشعراء، فتح علی شاہ کا تذکرہ، اسی طرح سے بزم سخن، مہر جہاں تاب، اور حد یہ ہے کہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا گلشن بیخار سب فارسی ہی میں ہیں۔

آب حیات | مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کا یہ بہت بڑا علمی و ادبی کارنامہ اور اردو پر احسان ہے کہ آب حیات لکھ کر انھوں نے پہلی مرتبہ اردو والوں کو اردو شاعری کی کہانی اردو میں سنائی، وہ اردو زبان و ادب و شاعری کے گہوارے میں پلے تھے، اور اردوئے معلیٰ کے اجڑنے سے پہلے اس کی بہار دیکھی تھی، استاد ذوقؔ جیسے استاد کے عزیز شاگرد تھے، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، شیفتہؔ کی مجلسیں اور بے تکلف صحبتیں دیکھی تھیں، لکھنؤ بھی وہ اس وقت آئے تھے، جب ناسخؔ و آتشؔ کے تذکروں سے محفلیں گرم اور دبیرؔ و انیسؔ کی خوش نوائی سے لکھنؤ کا چمن بول رہا تھا، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ پیدائشی طور پر سخن فہم و سخن شناس تھے، ان کا خمیر شعر و ادب سے اٹھا تھا، اور اس کا ذوق ان کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو گیا تھا، پھر وہ اس درجہ کے انشاپرداز ہیں کہ ان کی انشاپردازی دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے کلاسیکل ادب اور ان کے ادبی شہ پاروں سے آنکھیں ملاتی ہے، ان کے سب سے بڑے ناقد مولانا حکیم سید عبدالحی ؒ نے "گل رعنا" میں ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اور ان کے اس یگانۂ کمالی کا جس طرح اعتراف کیا ہے اس پر اضافہ مشکل ہے، وہ لکھتے ہیں:

> "سب سے بہتر اور عمدہ تصنیف ان کی آب حیات ہے، جو اردو زبان اور ریختہ شعر کی تاریخ میں پہلی کتاب اور اردو انشاپردازی کا بہترین کارنامہ ہے، عبارت کی

بے ساختگی اور برجستگی اور اس میں شاعرانہ تخیل، استعاروں کی دلفریبی کے ساتھ ایسی چیز ہے، جس پر غزلوں کے سیکڑوں دیوان قربان کر دینے کے قابل ہیں۔

اس کتاب کی مقبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ جو غلط اور نادرست روایتیں مصنف کے جادو نگار قلم نے لکھ دی ہیں، وہ آج اردو کی انشاء پردازی کے قالب میں روح کی طرح پیوست ہوگئی ہیں اور ضرب المثل کی طرح زبانوں پر چڑھ گئی ہیں، جس طرح اقلیدس کے اصول موضوعہ بے چون وچرا مانے جاتے ہیں، اسی طرح ان کو بے تکلف کام میں لایا جاتا ہے[1]"

گل رعنا لکھنے کی ضرورت | لیکن کوئی موضوع کسی بڑے سے بڑے مصنف پر ختم اور اس کے لیے وقف نہیں ہوتا، اور کوئی کتاب بھی (خواہ وہ کتنے ہی عظیم مصنف کے قلم سے نکلی ہو) اپنے فن وموضوع کی آخری کتاب قرار نہیں دی جاسکتی، علم وفن، فلسفہ وحکمت، شعر وادب، صناعی ومعماری، مصوری ونقاشی، اختراع وایجاد سب کی وسعت وترقی کا راز اسی نکتہ میں ہے کہ ان کے کسی نقش کو نقش دوام اور ان کی تحقیق کو حرف آخر قرار نہیں دیا گیا، اور حوصلہ مند مصنفین اور نیک نیت ماہرین فن اور علم وتحقیق کی سچی لگن رکھنے والے اہل قلم نے اپنے پیشروؤں کے فضل وکمال اور ان کی اولیت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کا علمی محاسبہ بھی کیا اور تحقیق کا ایک قدم آگے بڑھانے اور ان کے معلومات کے اندوختہ میں اضافہ کرنے کی جرأت کی، یہ دنیا کی کسی زبان اور کسی علم وفن کی تاریخ میں کبھی بھی گناہ یا شوخی وگستاخی نہیں قرار دی گئی، بلکہ ہر نئی نسل کے بساط علم وتحقیق کے تازہ واردوں کے کان میں ہمیشہ یہی غیبی آواز آتی اور ان کا دل بڑھاتی رہی ؎

---

[1] گل رعنا ص ۵۰، طبع چہارم ۱۳۷۰ھ (۱۹۵۱ء)

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

آب حیات بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں، وہ اپنی غیر معمولی مقبولیت اور اپنی اعلیٰ انشاء پردازی دقیق نکتہ سنجی بلکہ ذوق آفرینی اور ادب آموزی کے ساتھ ہر انسانی کام کی طرح نقائص سے یکسر مبرا اور غلطیوں اور فروگذاشتوں سے کلیتہً خالی نہ تھی، مولانا آزاد پیدائشی اور خلقی طور پر ادیب تھے اور ادب وحسن انشاء ان کے تیغ قلم کا اصل جوہر ہے، ادبی مزاج اور تاریخی مزاج میں ایک طرح کا بُعد اور ادبی تقاضوں اور تاریخی تقاضوں میں بعض اوقات تعارض پایا جاتا ہے، ادب تخیل پسند ہوتا ہے اور تاریخ حقیقت پسند، ادب اپنی پرواز کے لیے آزاد اور بے قید فضا چاہتا ہے، تاریخ اپنے سفر کے لیے ایک محدود اور نپا تلا راستہ، ادب تشبیہ واستعارہ اور تخیل سے آب ورنگ پیدا کرتا ہے اور تاریخ حوادث واقعات اور قدیم تحریروں کی پابندی سے گرانبار ہوتی ہے، مولانا آزاد کا اصل مزاج اور رجحان طبیعت ادب وانشاء پردازی ہے، وہ خواہ کسی تاریخی موضوع پر قلم اٹھائیں یہ ذوق ان پر غالب آکر رہتا ہے، اس کی مثال دیکھنا ہو تو دربار اکبری کا مطالعہ کیا جائے۔

آب حیات کے ان تشنہ گوشوں کو جو ایک نئی تصنیف کے متقاضی تھے، ہم تین قسموں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

(۱) آب حیات میں جن شعراء کا تذکرہ ہے، بہت خوب ہے، اور آزاد نے ان کے بارے میں اپنی سخن شناسی اور ذوق کی لطافت کا پورا ثبوت دیا ہے، لیکن ہر دور کے شعراء کی ایک بڑی تعداد جن میں سے بہت سے ان شعراء کے ہم پایہ تھے جن کا تذکرہ آب حیات میں آیا ہے، اور بعض اپنے ان خوش قسمت معاصرین سے جن کا آب حیات میں تذکرہ آگیا ہے بلند پایہ تھے، نظر انداز ہوگئی ہے، ان کے تذکرہ کے بغیر اردو شاعری کی

مسلسل تاریخ میں بیچ بیچ میں خلا محسوس ہوتا ہے اور بعض اہم کڑیاں مفقود نظر آتی ہیں۔

مثلاً طبقۂ متقدمین میں سے مولانا نصرتی، فقیر اللہ آرزو، میر سراج الدین سراج، میرزا داؤد داؤد، میر عبد الولی عزلت، عارف الدین خان عاجز اور محمد حسین کلیم نظر انداز ہوگئے ہیں ان میں سے بعض کا کلام بالخصوص میر سراج الدین سراج کے اشعار صفائی زبان کا نمونہ اور اردو شاعری کی ترقی و پیش رفت کے اظہار کے لیے سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں، اور میرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد کے کلام سے لگا کھاتے ہیں، نیز دور متوسطین میں سے انعام اللہ خاں یقین، میر محمد باقر حزیں، میر محمد بیدار، میر قدرت اللہ قدرت، میر ضیاء الدین ضیاء، حکیم ثناء اللہ خان فراق، میر نظام الدین ممنون، بہادر شاہ ظفر، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ، کرامت علی شہیدی کا تذکرہ موجود نہیں، شیخ قیام الدین قائم، اور شیخ بقاء اللہ بقاء کا تذکرہ حاشیہ میں چند چند سطروں میں آیا ہے، ان میں سے یقین، ممنون، ظفر، شیفتہ[1] کسی طرح سے آزاد کے سے جوہر شناس اور کمال کے سچے قدردان کی قدردانی سے محروم ہونے کے لائق نہ تھے، اور سہو یا تغافل کی توجیہ اس حالت میں آسان نہیں کہ اس تذکرہ میں میر ضاحک، میر مستحسن اور خلیق جیسے شعراء موجود ہیں جن کے دو دو، چار چار شعر سے زیادہ آزاد کو نہ مل سکے، اور نہ انھوں نے اپنے عہد اور ادبی رجحانات پر کوئی اثر ڈالا، متاخرین کے دور کو لو تو خواجہ محمد وزیر وزیر، میر وزیر علی صبا، نواب سید محمد خاں رند مرزا محمد رضا برق، میر علی اوسط رشک، مرزا اصغر علی خان نسیم، میر مظفر علی اسیر، شیخ امداد علی بحر، قلم انداز ہو گئے ہیں، اور اسی طرح لکھنؤ کے ان نامی گرامی شعراء کے تذکرہ سے آب حیات خالی ہے جن کا اس عہد میں طوطی بولتا تھا، اور جو دور دور شہرت و مقبولیت حاصل کرچکے تھے،

[1] نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کا صرف نام اور ولدیت مومن خان کے تذکرہ میں آگئی، اور اس کا ذکر ہے کہ وہ گلشن بے خار کے مصنف ہیں۔

اسی طرح منشی امیر احمد امیر مینائی، نواب مرزا خان داغ، مرزا قربان علی سالک، میر مہدی مجروح اور حکیم ضامن علی جلال اس بزم میں نظر نہیں آتے، جن کی شاعری سے نہ صرف لکھنؤ بلکہ رام پور، حیدر آباد اور خود دہلی کی مجلسیں معمور و مخمور تھیں، اس موقع پر یہ عذر نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی شاعری کے شہپر نے آزاد کی وفات کے بعد بال و پر نکالے اور انھوں نے ارتقاء کے منازل طے کیے، اس لیے کہ یہ سب وہ ہیں جو شاعری کی دنیا میں نام پیدا کرکے آزاد کی وفات (۱۳۲۷ھ ۱۹۰۸ء) سے کئی کئی سال پہلے اس دنیا سے سفر اختیار کرچکے تھے، اور آزاد جیسا اردو ادب و شاعری کا قدردان اور مبصر ان سے بے خبر نہیں ہو سکتا، اسی طرح سے آزاد نے انیس و دبیر کا تذکرہ دل لگا کر کیا ہے اور ان کی معنی آفرینی نازک خیالی اور بلند پروازی اور شکوہ الفاظ کی دل کھول کر داد دی ہے، لیکن ان ہی اوصاف میں مولوی محمد محسن محسن کاکوروی جو ان سے کسی طرح کم نہیں جن کے متعلق امیر مینائی کہتے ہیں؛

"ان کا کلام ایک عالم ہے خیالات نادرہ کا کہ جس کو دیکھ کر انسان حیران ہوجاتا ہے،

اور ان کا ہر شعر معراج بلاغت ہے[1]"

ان کی نظمیں صبح تجلی، چراغ کعبہ اور سراپا وغیرہ کے بند پڑھتے جائیں، وہ نازک خیالی، مضمون آفرینی، تشبیہات و استعارات کی تازگی اور لطیف تلمیحات میں کسی طرح سے انیس و دبیر سے کم نہیں، فرق یہ ہے کہ انھوں نے اپنی ساری ذہانت و محنت نعت نبوی اور مدیح خیر المرسلین میں صرف کی، اور انیس و دبیر نے مرثیہ و منقبت، مصائب اہل بیت اور واقعہ کربلا کے بیان کرنے میں، جس سے آزاد کے دل کو زیادہ لگاؤ اور وابستگی تھی، اپنی ذہانت اور قوت شاعری صرف کی۔

[1] مقدمہ مکتوبات امیر مینائی۔

اسی طرح سے آب حیات اپنے مصنف کے دور تک بھی اردو شاعری کے تمام عہدوں کے باکمال شعراء کے پورے تذکروں پر حاوی نہ تھی اور بہت سے ایسے شعراء و اساتذہ نظر انداز ہو گئے جو نظر انداز ہونے کے قابل نہ تھے۔

اسی طرح آزاد کی آخری زندگی اور ان کی وفات کے بعد خواجہ الطاف حسین حالی، مولوی محمد اسماعیل میرٹھی، لسان العصر میر اکبر حسین الہ آبادی نے اردو شاعری میں ایک نیا رنگ اور نیا آہنگ پیدا کیا، خود مصنف آب حیات مولوی محمد حسین آزاد بھی اس کے مستحق تھے کہ ان کو اس بزم میں جگہ دی جائے اور اردو شعراء کا تذکرہ جو ان کی وفات کے بعد لکھا گیا ہو ان کے تذکرہ سے خالی نہ ہو، اس لیے ایک تصنیف کی ضرورت تھی جو اس کمی کو پورا کرے، اور اس عہد تک کے لیے ایک جامع تذکرہ کہلانے کی مستحق ہو۔

(۲) آب حیات میں متعدد تاریخی فروگذاشتیں پائی جاتی ہیں، اور بعض ایسے بیانات ہیں جن کی تصدیق ان اصل کتابوں سے نہیں ہوتی جن کا حوالہ دیا گیا ہے، اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ آزاد نے ان کے بارے میں سنی سنائی روایات پر یا اپنے حافظہ پر اعتماد کیا، اور کتاب کی تصنیف کے وقت اصل ماخذ کی طرف رجوع کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی، یا ان کتابوں کے کسی شوشہ اور نقطہ کو اپنے گوہر بار قلم اور قوت متخیلہ سے بڑھا چڑھا کر کہیں سے کہیں پہونچا دیا، وہ زمانہ کتابوں کی کمیابی کا تھا، اس لیے کوئی حیرت و استعجاب کی بات نہیں کہ اردو کے بعض بنیادی تذکرے ان کی نظر سے نہ گذرے ہوں، مثلاً اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ میر تقی میر کا تذکرہ "نکات الشعراء" ان کی نظر سے نہیں گذرا، اور اس کے لیے آب حیات میں داخلی شہادتیں موجود ہیں، غالباً سب سے پہلے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی نے "نکات الشعراء" (جس کو انجمن ترقی اردو نے نظامی پریس

بدایوں سے شائع کیا) کے مقدمہ میں اسکو وضاحت اور قوت کے ساتھ ظاہر کیا،[1] اور آب حیات اور نکات الشعراء میں متعدد مقامات میں تضاد ظاہر کر کے آخر میں لکھا ہے:

"میری بدگمانی معاف ہو تو میں کہوں گا کہ "نکات الشعراء" آزاد کی نظر سے نہیں گذرا، قیاس کی بلند پروازی نے طوطے مینا بنا کر اڑائے ہیں، اور ان کی سحر بیانی نے سامعین کو خوش کیا ہے۔[2]"

یہاں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) آزاد کہتے ہیں کہ میر صاحب دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے، اس میں ایک ہزار شاعروں کا حال لکھوں گا، مگر ان کو نہ لوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو" دیباچہ میں کہیں نہیں ہے کہ اس میں ایک ہزار شاعروں کا تذکرہ لکھوں گا، یہ بھی نہیں ہے کہ ان کا ذکر نہیں لکھوں گا جن سے دماغ پریشان ہو، "نکات الشعراء" کے مطبوعہ نسخہ میں صرف ایک سو دو (۱۰۲) شعراء کا تذکرہ ہے۔

(۲) آزاد لکھتے ہیں کہ ان ہزار میں سے ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا، "نکات الشعراء" کے مطالعہ سے اس کی بالکل تصدیق نہیں ہوتی، بلکہ اس کے خلاف ان کی فراخدلی، صاف دلی اور وسیع المشربی کا برملا ثبوت ملتا ہے، وہ اعتراف کمال، تحسین سخن شناسی کی روشن مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔

(۳) آزاد نے لکھا ہے کہ ولی ہی نوع شعراء کا آدم ہے، اس کے حق میں فرماتے ہیں:
"وے شاعریست از شیطان مشہور تر" (آب حیات ص ۱۹۵، مطبوعہ مفید عام پریس ۱۸۹۹ء)

---

[1] ملاحظہ ہو: "آب حیات" اور "نکات الشعراء"۔ نکات الشعراء ص ۲۰ - ۲۴ [2] نکات الشعراء (مقدمہ) ص ۲۴۔

یہ فقرہ "نکات الشعراء" میں کہیں موجود نہیں، اس کے بجائے "نکات الشعراء" میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں: "از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد۔"

(۴) آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ میر صاحب نے میر سوز کو پاؤ شاعر مانا ہے، ایک خود، ایک مرزا رفیع، آدھے خواجہ میر درد، پاؤ میر سوز، مصنف گل رعنا لکھتے ہیں کہ یہ آزاد کی صرف بذلہ سنجی ہے، نکات الشعراء میں خواجہ میر درد اور میر سوز کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اس کے بالکل برخلاف ہے، اسی طرح ان کے تخلص کے متعلق جو لطیفہ آب حیات میں ہے، نکات الشعراء سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، میر صاحب نے ان کے تخلص کی تبدیلی کے واقعہ کو ممنونیت اور بزرگانہ انداز سے بیان کیا ہے۔

اسی طرح آزاد نے میر صاحب کی بد دماغی و نازک مزاجی کی جو تصویر کھینچی ہے اور نواب سعادت علی خان کا سامنا ہو جانے اور ان کی بے پرواہی اور بے نیازی کا جو نقشہ بیان کیا ہے، پھر خلعت بحال کرنے اور دعوت کا ایک ہزار روپیہ بھیجنے اور رد و کد کے بعد قبول کرنے کا جو واقعہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے، اس کی واقعات سے تصدیق نہیں ہوتی، مصنف گل رعنا نے میر صاحب کے ایک ہم عصر مرزا لطف علی کی کتاب "گلشن ہند" کے حوالہ سے ثابت کیا ہے کہ ان کا مشاہرہ کبھی موقوف نہیں ہوا، اور ۱۲۱۵ھ تک ان کا یہی حال رہا، انھوں نے ثابت کیا ہے کہ ۱۲۱۵ھ میں جب میر صاحب کی تنخواہ جاری تھی خود انشاء اللہ خان کی رسائی پہلی مرتبہ نواب سعادت علی خاں کے دربار میں ہوئی، اس لیے درایۃً بھی یہ واقعہ صحیح نہیں، انھوں نے ان تمام واقعات پر جو میر صاحب کی طرف منسوب کیے گئے ہیں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ آزاد نے میر صاحب کی جو تصویر آب حیات میں کھینچی ہے وہ انکے

منھ پر کھلتی نہیں، کچھ شبہ نہیں میر صاحب نازک مزاج تھے، مگر آزاد نے جو واقعات لکھے ہیں اگر آج وہ کسی میں پائے جائیں تو ہر شخص اس کو نازک مزاج نہیں "خود دماغ" سمجھے گا۔"[1]

آزاد کی واقفیت اودھ کی تاریخ سے زیادہ گہری اور وسیع نہیں، اور یہ کوئی قابل تعجب بات نہیں کہ اودھ کی تاریخ کا مواد ان کو نہ ملا ہو، اس لیے ان کے قلم سے بعض ایسی روایتیں نکل گئی ہیں جو محض ناواقفیت اور سطحی معلومات پر مبنی ہیں، مصنف گل رعنا لکھتے ہیں:

"آزاد کہتے ہیں کہ "سودا ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہونچے، نواب شجاع الدولہ نے بے تکلفی یا طنز سے کہا: مرزا تمھاری وہ رباعی اب تک میرے دل پر نقش ہے۔ پاس خودداری پھر دربار نہ گئے۔" یہ سب افسانہ ہے، شجاع الدولہ فیض آباد میں رہتے تھے، لکھنؤ کی اس وقت ایک قصبہ سے زیادہ حیثیت نہ تھی، یہ بھی غلط ہے کہ وہ دلی سے براہ راست یہاں آئے، یہ بھی غلط ہے کہ سودا ایک بار کے سوا پھر دربار نہیں گئے، شجاع الدولہ جب تک جیتے رہے، یہ ان کی ملازمت میں رہے، ان کے کلیات میں متعدد قصیدے شجاع الدولہ کی تعریف میں موجود ہیں، مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں: "ہر جا کہ می رفت عزت و حرمت تمام می یافت، نواب مرحوم و مغفور نیز بودنش او را در سرکار خود غنیمت می دانستند۔"[2]

صرف نکات الشعراء ہی نہیں، اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد کی نظر سے مصحفی کا تذکرہ بھی نہیں گذرا، یا کم سے کم آب حیات کی تصنیف کے وقت وہ پیش نظر نہیں تھا، انھوں نے سید انشاء کے اس زمانہ کا نقشہ کھینچتے ہوئے جب اقبال نے ان سے منھ موڑ لیا تھا اور انکے ولی نعمت (نواب سعادت علی خان) کی نگاہیں ان سے پھر گئی تھیں، مرزا سعادت یار خان رنگین

---

[1] حاشیہ گل رعنا ص ۱۵۹-۱۶۰ طبع چہارم [2] گل رعنا ص ۱۳۹ طبع چہارم۔

سے نقل کیا ہے کہ "تیسری بار گیا تو ان کو ایک مشاعرہ میں اس طرح دیکھا کہ ایک شخص میلی کچیلی روئی دار مرزئی پہنے، سر پر ایک میلا سا پھینٹا، گھٹنا پاؤں میں، گلے میں پیکوں کا توبڑا ڈالے، ایک لکڑ کا حقہ ہاتھ میں لیے آیا، توبڑہ میں سے ایک کاغذ نکالا، غزل پڑھی اور کاغذ پھینک چل دیا۔"

اس موقع پر آزاد نے انشاؔ کی وہ غزل لکھی ہے جس کا مطلع ہے:

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں　　بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

مصنف گل رعنا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آزاد نے انشاؔ کی وہ مشہور غزل اس جگہ نقل کی ہے جو اس موقع کے لیے نہایت موزوں ہے، اور اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

نہ چھیڑ اے نکہتِ بادِ بہاری راہ لگ اپنی　　تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں"

گر واضح رہے کہ یہ غزل انشاؔ کی اس زمانہ کی تصنیف نہیں جو ان کے جنون اور بیچارگی کا زمانہ بیان کیا جاتا ہے۔ میں نے اس غزل کے چند اشعار تذکرہ مصحفیؔ میں پڑھے ہیں جو اس زمانہ میں لکھا گیا ہے جس وقت انشاؔ لکھنؤ پہونچے بھی نہ تھے۔ مصحفیؔ نے تذکرہ میں وہاں تک کا حال لکھا ہے کہ مرشد آباد سے دلی آچکے ہیں، اور مرزا عظیم بیگ وغیرہ شعرائے دلی سے معرکے در پیش تھے[1]

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"آزاد نے انشاؔ کے مجنوں ہو جانے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی ایسی درد انگیز تصویر کھینچی ہے کہ اس کو ان ہی کے الفاظ میں پڑھو تو دل بے قابو ہو جاتا ہے، اور حقیقت میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزاد کی نری جادو طرازی ہے۔ حیات دبیر کے مصنف نے مرزا اوجؔ کی زبانی لکھا ہے جو میر انشاؔ کے

---

[1] حاشیہ گل رعنا ص ۲۶۲ طبع چہارم۔

نواسے تھے کہ سید انشاؔ نہ مجنون ہوئے، نہ ان کی تنخواہ بند ہوئی، صرف اتنا صحیح ہے کہ نواب سعادت علی خان نے حکم دے دیا تھا کہ وہ سوا دربار کے اور کہیں نہ آئیں جائیں، اور دربار بھی اس وقت حاضر ہوں جب ان کو بلایا جائے۔ انشاؔ نے اسی حبس بیجا کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؎

بدوں حکم وزیر الممالک اے آغا　　چساں کنم حرکت نوکری ست یا اذیت"[1]

یہ اُن چند تاریخی فروگذاشتوں اور غیر محتاط یا مبالغہ آمیز تصویر کشی کی چند مثالیں ہیں، جو آب حیات کے صاف آئینہ پر دھبہ کی طرح نمایاں ہوتی ہیں، اور ان کی تحقیق اور اصل واقعہ کا اظہار ہر اس دیانت دار مورخ کا فرض تھا جو اس موضوع پر آزاد کے بعد قلم اٹھاتا اور ہمارے علم میں گل رعنا میں سب سے پہلے اس فرض کو انجام دینے کی کوشش کی گئی۔

آب حیات میں اساتذہ سخن کے تذکرے، ان کے محاسن و کمالات کا اعتراف و اظہار اور اُن کے مرتبہ و مقام کے تعین نیز بعض ہمعصر اور باہم دیگر مقابل شعراء کے موازنہ کے بارہ میں کچھ ایسی خامیاں پائی جاتی ہیں جن کو ہم اگر آزاد کے احترام اور ان کے فضل و کمال کے اعتراف میں "ناانصافیاں" نہ کہیں تو "ناہمواریاں" ضرور کہہ سکتے ہیں۔ متعدد مقامات پر ان کے مذہبی جذبات یا ذاتی تعلقات غیر جانبدارانہ تاریخ نویسی کے تقاضوں پر غالب آگئے ہیں۔ اس بے اعتدالی کا سب سے زیادہ احساس مرزا مظہر جان جاناںؒ کے تذکرہ کے موقع پر ہوتا ہے۔ مرزا صاحب ہندوستان کی اُن باکمال ہستیوں میں ہیں جن کے وجود پر اس سرزمین کو فخر ہے۔ بہت سے اہل بصیرت کے نزدیک سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ میں مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے بعد ان کے پایہ کا بزرگ نظر نہیں آتا۔ ان کے نامور اور صاحب نظر

---

[1] گل رعنا ص ۲۶۲ طبع چہارم۔

معاصر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ جو خود یگانۂ روزگار تھے، ان کے متعلق لکھتے ہیں:

"ہمارے اس دور میں ان ملکوں میں (جن سے ہم واقف ہیں) کسی ملک میں ان کا ہمسر پایا نہیں جاتا، دورِ ماضی اور بزرگانِ سلف میں اس کا سراغ لگ سکتا ہے، بلکہ سچ پوچھو تو ہر زمانہ میں ایسے بزرگ زیادہ تعداد میں پائے نہیں جاتے، چہ جائیکہ ایسے زمانہ میں جو فتنہ و فساد سے پُر ہے۔"[1]

آزاد نے ان کے تذکرہ میں نہ صرف ان کے مرتبہ و مقام کا لحاظ نہیں رکھا، بلکہ ان ہزاروں لاکھوں مسلمانوں کے جذبات کا بھی احترام نہیں کیا جو ان کے عقیدت مند اور حلقہ بگوش تھے، اول تو ان کی نازک مزاجی کو اس انداز سے پیش کیا جس سے نہ صرف ان کی غیر واقعی تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے بلکہ میر صاحب سے بھی کچھ آگے بڑھ کر وہ ایک تنک مزاج، مغلوب الغضب اور غیر مہذب انسان کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، اس میں آزاد نے صرف رنگ آمیزی ہی سے کام نہیں لیا بلکہ اس میں مذہبی جذبات کی بھی (جو افسوس ہے کہ اکثر حقائق پر پردہ ڈال دیتے ہیں) کی جھلک بھی پیدا ہوگئی ہے، پھر ان کی طرف بعض ایسے واقعات منسوب کیے ہیں جو ان کے مرتبہ کے دینی پیشوا اور مقتدائے خلائق سے قطع نظر ایک خوش وضع اور ثقہ آدمی کے مرتبہ سے بھی مناسبت نہیں رکھتے۔

مصنف گل رعنا نے جو آزاد کے برخلاف تصوف و صوفیہ کی تاریخ ان کے مزاج و مذاق سے زیادہ آشنا اور مراتب رجال سے زیادہ واقف ہیں اور جن کو براہ راست مرزا صاحب کے افادات و تحقیقات، ان کے علوم عالیہ و مضامین نادرہ پڑھنے اور ان کے متعلق ان کے معاصرین کی شہادتوں سے واقف ہونے کا موقع ملا ہے، اس طرز نگارش پر احتجاج آمیز تنقید کی ہے جو ان ہی کی

[1] کلمات طیبات ص ۱۹۴ - ۱۹۵۔

نہیں ان لاکھوں مسلمانوں کے دلی جذبات کی ترجمانی کی ہے جو مرزا صاحب کے ہم عقیدہ اور عقیدت مند ہیں، وہ مرزا صاحب کے حالات و کمالات کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"افسوس ہے کہ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے حسب معمول ان کے حالات بیان کرنے میں چٹکیاں لی ہیں، کہیں واقعہ کی صورت ایسی بنائی ہے جس سے بجائے مدح کے ذم کا پہلو نکلتا ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ان کے باب میں بہت سے لطائف ایسے مشہور ہیں کہ اگر آج کسی میں پائے جائیں تو زمانہ کے لوگ اچھا نہ سمجھیں، کچھ تو اس اعتقاد سے

خطائے بزرگان گرفتن خطاست

اور کچھ میں سیاہ رو بزرگوں کی ہر بات کو چشم عقیدت کا سرمہ سمجھتا ہوں۔" الخ (ص ۱۳۸)

"تاباں کا حال جیسا چمکا کر لکھا ہے، اور سرگوشیوں کا فسانہ جس طرح بیان کیا ہے، وہ بھی ملاحظہ طلب ہے، (ص ۱۳۹) شعر مندرجہ (ص ۱۴۰) کو پڑھیے پھر مرزا صاحب جیسے مہذب کو اور آزاد کی معذرت کو دیکھیے، فرماتے ہیں کہ "تہذیب آنکھ دکھاتی ہے مگر کیا کیجئے ایشیا کی شاعری کہتی ہے کہ یہ میری صفائی زبان اور طراری کا نمک ہے" (ص ۱۴۰) مرزا رفیع سودا کی ہجو پر حاشیہ چڑھاتے ہیں کہ ایک دھوبن گھر میں ڈالی تھی۔"[1] (ص ۱۴۲)

اس کے بعد ان واقعات کی حقیقت بیان کرتے ہوئے جو آزاد نے دوسرے رنگ سے بیان کیے ہیں اور یہ ثابت کرنے کے بعد کہ واقعات کو غلط شکل میں پیش کیا گیا ہے، لکھتے ہیں:

"اصل یہ ہے کہ مولانا آزاد نے مرزا صاحب کو آب حیات میں ناخواستہ طبیعت جگہ دی ہے، جیسا کہ ان کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے، وہ جوش و خروش اور کثرت کلام

[1] گل رعنا ص ۱۲۸ - ۱۲۹۔

"ڈھونڈتے ہیں جو یہاں نہیں ملتا"[1]

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"یہاں تو نہیں مگر میر ضاحک اور میر خلیق کے یہاں کیا مل گیا، میر ضاحک کا ایک شعر اور میر خلیق کے دو شعر ہاتھ آئے، مگر ان کے حالات لکھنے کی بے چینی ملاحظہ ہو، میر ضاحک کے حالات میں فرماتے ہیں: ابتدا سے دل چاہتا تھا کہ اس خانوادہ سیادت کا سلسلہ مسلسل لکھوں، مگر پھول نہ ہاتھ آئے جو لڑی پروتا، اب کہ طبع ثانی کا موقع ہے، آرزوئے قدیم پھر دل میں لہرائی، ناچار برسوں کے سوکھے مرجھائے پھول دل افسردہ کے طاق میں پڑے ہوئے تھے ان ہی کا سہرا بنا کر سادات عظام کے روضوں پر چڑھاتا ہوں۔"

(آب حیات، ص ۱۶۷)[2]

اس کے بعد وہ مرزا صاحب کے بارہ میں میر صاحب اور مصحفی جیسے نقادانِ سخن کی شہادتیں اور اعترافات نقل کرتے ہیں، اور ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہیں، اسی افسردگی اور بے دلی کی وجہ سے آزاد نے مرزا صاحب کے صرف بیس[3] اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے ہیں، مصنف گل رعنا نے ان کے کلام کا زیادہ سے زیادہ نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور غالباً مرزا صاحب کے اتنے اردو اشعار یکجا کسی تذکرہ میں نہیں آئے ہیں، یہ تعداد میں اکتالیس ہیں[4]

مصحفی اور انشا کے تقابل میں پھر یہی اندرونی جذبہ ابھر کر سامنے آگیا ہے، آزاد سے نقادِ سخن فہم اردو شاعری کے ادا شناس اور مزاج داں سے اس کی بالکل توقع نہیں تھی کہ وہ مصحفی جیسے مسلم الثبوت استاد اور صاحب طرز شاعر پر جنکے کمالات و فتوحات کی سرحدیں بارہا میر و سودا کی سرحدوں سے مل گئی ہیں اور ان کے بعض اشعار صرف اردو شاعری میں نہیں

[1] گل رعنا ص ۱۳۱ [2] حاشیہ گل رعنا ص ۱۳۱۔

بلکہ مطلق شاعری کی تاریخ اور اس کے منتخب اشعار میں جگہ پانے کے مستحق ہیں، سید انشا کو ترجیح دیں گے جن کے متعلق دور آخر کے سب سے بڑے مبصر نواب مصطفےٰ خان شیفتہ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ "ہیچ صنف را بطریقۂ راسخۂ شعرا نہ گفتہ" اور جن کے متعلق انھوں نے خود لکھا ہے کہ "ان کی بے اعتدالیاں کچھ جہالت کا سبب نہ تھیں بلکہ عمداً تھیں یا بے پروائی کی وجہ سے تھیں کہ اپنی طبع وقاد اور جامعیت استعداد کے سامنے قواعد اور اہل قواعد کو خاطر میں نہ لاتے تھے" آگے لکھتے ہیں کہ "انھوں نے الفاظ اور محاورات میں بہت سے تصرف کیے، یہ تصرف اگر صرف معدودے مقاموں میں ہوتے تو شکایتیں نہ ہوتیں، کیونکہ اس زبان آور سے زیادہ قادر زبان اور زبان داں کون ہے؟ بخصوصاً جبکہ استعداد علمی سے مسلح ہو، لیکن افراط نے ہمیں بھی خاموش کر دیا ہے"[1]

آخر وہی ہوا کہ زمانہ نے جس کے متعلق انھوں نے اپنے بلیغ انداز میں لکھا ہے کہ "وقت حاکم جابر ہے اور پسند عام اس کا واضع قانون ہے" زمانہ نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا، سید انشا کی ہنگامہ خیزیاں، بزم آرائیاں اور بذلہ سنجیاں ان کے ساتھ گئیں اور ان کے کلام کا بیشتر حصہ بھی اپنے ساتھ لے گئیں، مصحفی کا کلام باقی ہے، اور زمانہ جتنا گذرتا جاتا ہے اس کی آب و تاب بڑھتی جا رہی ہے، اور تحقیق و تحسین کے نئے نئے گوشے پیدا ہوتے جا رہے ہیں، آب حیات کا وہ حصہ جس میں ان دونوں کا محاکمہ ہے اور لکھنؤ کی معرکہ آرائیوں کی موئے قلم سے تصویر کھینچی گئی ہے ان کے ذاتی رجحان اور اندرونی جذبہ کی صرف غمازی نہیں آئینہ داری کرتا ہے جو آزاد جیسے بے لاگ جوہری کے شایانِ شان نہیں۔

اسی طرح صرف مرزا مظہر جانِ جاناں ہی نہیں مومن خان جیسے استاد کا تذکرہ بھی

[1] آب حیات ص ۲۰۳-۲۰۴، مطبع کریمی لاہور۔

جو ایک مستقل دبستان کے بانی اور مسلّم الثبوت استاد ہیں، انھوں نے بادلِ ناخواستہ اور غالباً لوگوں کے توجہ دلانے سے کیا ہے، چنانچہ آبِ حیات کے پہلے ایڈیشن میں مومن خان کا تذکرہ نہ تھا۔ اس کی انھوں نے بعد کے ایڈیشن میں جو تاویل کی ہے وہ نظر میں جچتی نہیں، مومن خان جیسے نامور شاعر کے اتنے حالات بھی آزاد کو نہ ملیں (جس نے ان کا زمانہ دیکھا اور ان کی مجلسوں میں شریک ہوا) جس سے اتنا تذکرہ بھی مرتب کیا جا سکے جتنا کم سے کم میر ضاحک اور میر خلیق کا آیا ہے، سمجھ میں نہیں آتا، پھر تمہید کی سطریں بتاتی ہیں کہ انھیں مومن خان کو ذوق و غالب کی بزم میں لانے اور ان کی صف میں بٹھانے میں تامل ہے، وہ لکھتے ہیں:

"پہلی دفعہ اس نسخہ میں مومن خان صاحب کا حال نہ لکھا گیا، وجہ یہ تھی کہ دورہ پنجم جس سے ان کا تعلق ہے بلکہ دورِ سوم و چہارم کو بھی اہلِ نظر دیکھیں کہ جو اہلِ کمال اس میں بیٹھے ہیں، کس لباس و سامان کے ساتھ ہیں، کسی مجلس میں بیٹھا ہوا انسان جبھی زیب دیتا ہے کہ اسی سامان و شان اور وضع و لباس کے ساتھ ہو جو اہلِ محفل کے لیے حاصل ہے، نہ ہو تو ناموزوں معلوم ہوتا ہے[۱]۔"

لیکن پھر زمانہ نے دوبارہ اپنا حاکمانہ فرمان صادر کیا اور ذوق اور معلوم نہیں کتنے شعراء کے بجائے جن کا آزاد نے آب و تاب کے ساتھ ذکر کیا ہے، مومن خان کو اہلِ ذوق اور اہلِ تحقیق کی توجہات کا مرکز بنا دیا، اور ان کے کلام کو ایک نئی زندگی اور تابانی عطا کی۔

غالب کے تذکرہ میں انھوں نے بے ضرورت ایسے لطیفے لکھے جس سے ان کے اثنا عشری رجحان اور صحابۂ کرامؓ پر طنز کا اظہار ہوتا ہے[۲]، اس کے مقابلہ میں استاد ذوق کا مذہب بیان کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے، لکھتے ہیں:

---

۱ آبِ حیات ص ۴۲۰۔ ۲ ملاحظہ ہو آبِ حیات ص ۵۲۸ - ۵۳۰۔

"علماء اور اساتذۂ سلف کو ہمیشہ با ادب یاد کرتے تھے، اور کبھی ان پر طعن تشنیع نہ کرتے تھے، اس واسطے ان کے مذہب کا حال کسی پر نہ کھلا[۱]۔"

اپنے استاد و مربی سے عقیدت، حسنِ فطرت اور شرافت کا جوہر ہے، آزاد نے اپنے استاد کے حالات کو جس شیفتگی، دلی شغف اور ان کے کمالاتِ شاعری کو جس جوش و خروش کے ساتھ بیان کیا ہے اس پر وہ قابلِ ملامت یا مستحقِ شکایت نہیں، بلکہ تعریف و اعتراف کے مستحق ہیں، لیکن جب یہ چیز حدود سے آگے بڑھ جاتی ہے اور ایک کی حق شناسی کے ساتھ دوسرے کی حق تلفی شامل ہو جاتی ہے تو ضرور قابلِ شکایت ہے، آزاد نے بہادر شاہ ظفر کے کلام کے متعلق جو رائے دی ہے اور اس کو جس طرح استاد ہی کے پلہ میں ڈال دیا ہے اس سے خود استاد کی روح خوش نہ ہوگی، اور کلام کا فرق سمجھنے والا اس میں شاعر کی زندگی اور واردات کا عکس دیکھنے والا مطمئن نہیں ہوگا، آزاد لکھتے ہیں:

"بادشاہ کے چار دیوان ہیں، پہلے کچھ غزلیں شاہ نصیر کی اصلاحی ہیں، کچھ میر کاظم حسین بیقرار کی ہیں، غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سرتاپا حضرت مرحوم کے ہیں، جن سنگلاخ زمینوں پر قلم چلنا مشکل ہے ان کا نظام و سرانجام اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ دل شگفتہ ہوتے ہیں، والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بادشاہ تمہارا زمین کا بادشاہ ہے، طرحیں خوب نکالتا ہے، اگر تم سرسبز کرتے ہو ورنہ شورزار ہو جائے، مسودۂ خاص میں کوئی شعر پورا، کوئی ڈیڑھ مصرع، کوئی ایک، کوئی آدھا مصرع، فقط بحر اور ردیف و قافیہ، باقی بخیر، یہ ان ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھا کر حسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے[۲]۔"

---

۱ آبِ حیات ص ۴۶۷ ۲ ایضاً ص ۴۹۱

مصنف گل رعنا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"ہندوستان کی سلطنت دادا کے وقت میں جاچکی تھی، ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے برائے نام بادشاہ رہ گئے تھے، اور ان کی حکومت دہلی میں قلعہ معلّٰی کی چار دیواری کے اندر سمٹ کر رہ گئی تھی۔

لیکن اقلیم سخن کی فرماں روائی دادا سے ترکہ میں ملی تھی، اور اردوئے معلّٰی ان کے زیر نگیں تھا، افسوس ہے کہ وہ بھی مولوی محمد حسین آزاد نے ظفر سے چھین کر استاد ذوق کو بخش دی۔ ؎

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا　　بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را[1]"

پھر آگے اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں :

"لطف یہ ہے کہ چاروں دیوان اس بدنصیب بادشاہ کے چھپ چکے ہیں، اور حضرت ذوق کا بھی تھوڑا بہت، جو کچھ کلام مل سکا ہے وہ ایک دیوان کی شکل میں شائع ہوچکا ہے، ان دونوں کو پڑھو اور ہر ایک کے انداز سخن پر غور کرو، پھر اپنی فطرت سلیم سے فتویٰ لو، دونوں کی حیثیتیں جداگانہ نظر آئیں گی، ذوق پھر بھی ذوق ہیں، ظفر کے استاد ان کے کلام کی رنگینی، ترکیب کی چستی، مضمون کی بندش، جوش و خروش، ان کی باتیں ان کے ساتھ ہیں، ظفر کے ہاں جو سامان نظر آئے گا وہ اس سے ملتا جلتا ہوگا اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ استاد کا رنگ شاگرد میں آنا ضرور ہے، مگر پھر بھی وہ دوسری طرح کا ہوگا، محاوروں کی فراوانی یہاں زیادہ ملے گی، مگر جوش و خروش کی جگہ دل و جگر کے ٹکڑے حروف و الفاظ بن کر آنسوؤں کی سیاہی اور آہِ جگر دوز کے قلم سے لکھے ہوئے تم کو ملیں گے، اب انھیں

[1] گل رعنا ص، ۲۹۔

ظفر کا سمجھو یا ذوق کا[1]"

اسی طرح ان کو اس سے بھی اختلاف ہے کہ نواب الٰہی بخش خاں معروف کا کلام استاد ذوق ہی کی شاعری کا کارنامہ ہے، وہ لکھتے ہیں :

"آزاد نے آب حیات میں جس طرح ظفر مرحوم کی کاوش فکر پر پانی پھیرا ہے ان کے بھی نتائج فکر کو اپنے استاد ذوق کے دامن کمال سے وابستہ کر دیا ہے، باوجودیکہ اس کہنہ مشق شاعر کی عمر اس وقت چھیاسٹھ ۶۶ برس کی تھی اور ذوق بمشکل اٹھارہ برس کے رہے ہونگے مگر جوش عقیدت میں اس کا خیال نہیں رہا[2]"

ان فروگذاشتوں اور ناہمواریوں کے باوجود آب حیات کی "انفرادیت" قائم تھی، اور رہے گی، اور اس کی ادبی قدر و قیمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، ضرورت اس کی تھی کہ اس کے اس تاریخی حصہ کو مکمل کردیا جائے، اور ان کی ان غلطیوں کی نشاندہی کردی جائے جو مصنف کی ادبی افتاد طبع یا اس وجہ سے پیدا ہوئیں کہ مصنف کی نظر ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ پر وسیع اور گہری نہ تھی، اور وہ اس کے بعض شعبوں (مثلاً تصوف و سلوک، علماء و مشائخ کے حالات، ملفوظات و مخطوطات) کا رمز شناس اور خصوصی طالب علم نہیں رہا تھا۔

مولانا سید عبدالحئی صاحب نے اپنی عربی تصنیفات "نزہۃ الخواطر"، "معارف العوارف" اور "جنۃ المشرق" کی تالیف و ترتیب کے سلسلہ میں ہندوستان کی سیاسی، تمدنی، علمی اور ادبی تاریخ کا وسیع مطالعہ کیا تھا اور اس ضرورت سے انھوں نے سیکڑوں متعلق و غیر متعلق کتابیں اور ہزارہا صفحات پڑھے تھے، ان میں بلا ارادہ بہت سا مواد ان کی نظر سے گذرا، جس سے اردو

[1] گل رعنا ص، ۲۹، [2] حاشیہ گل رعنا ص، ۲۰۰ طبع چہارم۔

زبان کے آغاز، اس کی شعر و شاعری کی تاریخ اور اردو شعراء کے حالات زندگی اور ان کے کمالات پر روشنی پڑتی تھی، اور ان سے اردو زبان و شاعری کی تاریخ اور شعراء کا تذکرہ مرتب کرنے میں بیش قیمت مدد ملتی تھی، بہت سے نظریات کی جو اس وقت تک مشہور و مقبول تھے، تردید ہوتی تھی اور بہت سے نئے حقائق سامنے آتے تھے، آب حیات میں جس کا مطالعہ انھوں نے اس کی اشاعت کے بعد ہی کر لیا ہوگا بہت سی چیزیں ان کے تاریخی ذوق کو کھٹکیں اور ان کی مورخانہ نظر میں چبھی ہوں گی، اس لیے اس کا داعیہ پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا کہ وہ اس موضوع پر قلم اٹھائیں اور ان اغلاط کی تصحیح کریں جو نادانستہ آب حیات میں آگئی ہیں، اور یہ حق کسی صاحب قلم اور صاحب نظر سے چھینا نہیں جا سکتا۔

شاید ان کو اس کام کی تکمیل میں دیر لگتی، یا عربی تصنیفات کی تکمیل کا کام اور زندگی کے دوسرے مشاغل اس کی مہلت نہ دیتے کہ ۱۳۳۹ھ (مطابق ۱۹۲۱ء) میں وجع مفاصل کا ان پر حملہ ہوا، اور نقل و حرکت ان کو دشوار ہوگئی، مریضوں کو دیکھنا، مطب میں جانا، ندوۃ العلماء کے جلسوں میں شرکت سب ناممکن ہوگئی، تصنیفی و تحریری کام ان کی طبیعت ثانیہ بن گیا تھا، اور وہ یکسر بیکار و معطل نہیں رہ سکتے تھے، اس حالت میں وقت گذاری اور تفریح کے لیے ان کو اپنی پرانی بیاض یاد آئی، اس کو نکالا تو معلوم ہوا کہ مشہور مشہور شاعروں کا کلام اس میں آتنا جمع ہو چکا ہے کہ اگر اس کو ترتیب دے کر شائع کر دیا جائے تو پڑھنے والوں کو اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے، اسی کے ساتھ خیال ہوا کہ جن کا کلام ہو ان کے مختصر مختصر حالات بھی لکھ دیے جائیں، تذکرے جمع کیے اور کام شروع کیا، بات میں بات نکل آئی اور وہ ایک خاصی کتاب بن گئی۔[1]

[1] پیش لفظ مصنف گل رعنا ص ۳ طبع چہارم۔

یہ گل رعنا کی تصنیف کی مختصر کہانی ہے جو مصنف نے اس کتاب کی شان ورود کے سلسلہ میں خود سنائی ہے، اس کتاب کا مسودہ انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی، ناظم دار المصنفین کے پاس بھیج دیا جن سے ان کو عزیزانہ تعلق تھا، اس عرصہ میں ان کی وفات ہوگئی اور وہ کتاب کو مطبوعہ شکل میں نہ دیکھ سکے، غالباً جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ میں یہ کتاب دار المصنفین سے چھپ کر شائع ہوئی، اس لیے کہ جمادی الثانیہ ۱۳۴۳ھ، جنوری ۱۹۲۵ء کے معارف کے شذرات میں جو مولانا عبد السلام صاحب ندوی مرحوم کے قلم سے ہیں پہلی مرتبہ اس کتاب کا تعارف اور اس کی طباعت کا اعلان نظر آیا، اس وقت ان کے بہت سے دوستوں اور شناساؤں کے لیے یہ انکشاف تھا کہ ان کو اس موضوع سے اس درجہ کا ذوق اور واقفیت ہے، کہ اس موضوع پر ان کے قلم سے ایک ایسی وقیع تصنیف نکل سکتی ہے، رسالہ اردو (انجمن ترقی اردو اورنگ آباد) کے ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ جولائی ۱۹۲۵ء کے شمارہ میں اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب نے یہ صحیح لکھا:

"جو لوگ مولانائے مرحوم سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے انھیں ممکن ہے اس کا علم ہو ورنہ عام طور پر لوگ اس سے لا علم تھے کہ مولانا مرحوم اردو زبان و ادب کا ایسا اچھا ذوق رکھتے ہیں، اور ایسا خیال کچھ بے جا بھی نہ تھا، کیونکہ مولوی صاحبان نے عموماً اردو زبان کی طرف سے غفلت برتی ہے۔"[1]

معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادبی ذوق مولانا کو اپنے والد ماجد سے ورثاً ملا ہے، جو اردو و فارسی کے اچھے شاعر تھے، اور جن کا حال اور کلام کا نمونہ انھوں نے کتاب کے

[1] پچھلے دور کے فضلائے مدارس کے متعلق تو یہ کہنا کسی حد تک صحیح ہوگا، لیکن ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد تک کے علماء پر یہ الزام صحیح نہیں جیسا کہ ہم نے اس مضمون کے آغاز میں ذکر کیا ہے۔

آخر میں دیا ہے۔[1]

کسی تصنیفی کاوش کو اس زمانہ کے حدود، ماحول اور مصنف کے مقرر کیے ہوئے پیمانہ اور اس کے تصنیفی منصوبہ سے علٰحدہ کر کے کسی دوسرے زمانہ کے حدود و ماحول میں لے کر اس زمانہ کے معیاروں، اصطلاحوں اور مقرر کردہ اصولوں سے جانچنا اور ناپنا صحیح نہیں ہوتا۔ مصنف ادب وشاعری کے ان تنقیدی اصولوں سے واقفیت نہیں رکھتے تھے جو بیسویں صدی کے وسط میں مغربی ممالک میں دریافت کیے گئے، اور صدیوں کی کاوشوں کے بعد انھوں نے ارتقار کے منازل طے کیے۔ ان میں بھی ایک بڑا حصہ وہ ہے جو مغربی ماحول و معاشرہ کی آب و ہوا بالخصوص سیاسی و تمدنی عوامل کا نتیجہ اور مغربی زبانوں اور ان کے ادب وشاعری کے مخصوص مزاج سے تعلق رکھتا ہے، اور مشرقی زبانوں اور ان کے ادب وشاعری پر جوں کے توں ان کا انطباق نہیں کیا جا سکتا۔ مصنف گل رعنا نے کہیں بھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ یہ کتاب تنقید کا اعلیٰ نمونہ ہے، اور اس میں وہ تنقید کے اعلیٰ معیاروں کی پیروی کریں گے جو اس وقت تک دریافت ہو چکے ہیں۔ انھوں نے پوری حقیقت پسندی اور سادگی کے ساتھ اس کتاب کی ترتیب کے محرکات و دواعی اور اس تصنیف کے اغراض و مقاصد اور اس کے پیمانہ اور رقبہ کا اپنے پیش لفظ میں اظہار کر دیا ہے۔ انھوں نے اردو زبان وادب اور شاعری کی تاریخ کے طالب علموں کو اس کتاب کے ذریعہ بہت سی نئی معلومات دی ہیں، متعدد نئے ماخذوں کی طرف توجہ دلائی ہے، اردو زبان اور شاعری کے آغاز کو وہ آب حیات اور دوسرے قدیم تذکروں سے کئی قدم پیچھے لے گئے ہیں جب دکن و گجرات میں صوفیۂ کرام کے ذریعہ اس عام فہم بولی کا اور سلاطین دکن اور ان کے عہد کے شعرا کے ذریعہ اس مرغوب طبع شاعری کا

[1] رسالہ اردو، بابت جولائی ۱۹۲۵ء ص ۵۰۰۔

آغاز ہو گیا تھا، انھوں نے بہت سی تاریخی غلطیوں کی تصحیح کی اور بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب:

"ہر شاعر کے کلام سے نمونہ بھی دیا گیا ہے، جس سے فاضل مؤلف کی وسعت نظر کا ثبوت ملتا ہے، اگرچہ زبان و شعراء کے کلام پر اعلیٰ تنقید کا حق ادا نہیں کیا گیا، تاہم ہر شاعر کے کلام پر بہت ہی منصفانہ رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔"[1]

کتاب میں مفید حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے جو بہت معلومات افزا، دلچسپ اور ان کی اردو انشاپردازی اور سیرت نگاری کا عمدہ نمونہ ہیں، چونکہ ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ اور تراجم رجال ان کا خاص موضوع رہا ہے، "نزہۃ الخواطر" جیسی کتاب ان کے قلم سے نکل چکی ہے، اس لیے ان حاشیوں میں تاریخ کے طالب علموں کو بہت سی نئی معلومات اور ضخیم کتابوں کا عطر مل جاتا ہے، اودھ چونکہ ان کا وطن ہے، اور اس کی تاریخ کا انھوں نے بنظر غائر مطالعہ کیا ہے، اس لیے اس صوبہ سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں پر انھوں نے جو حواشی لکھے ہیں وہ بہت پُر از معلومات اور مبصرانہ ہیں اور ان میں ان شخصیتوں کی صحیح تصویر کشی اور سلطنت اودھ کے عہد کی بولتی ہوئی تصویر آگئی ہے، علم کی سچی پیاس اور اپنی زبان سے بے لوث محبت کا ہمیشہ سے یہ خاصہ رہا ہے کہ اگر ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے کام کی کوئی ایک چیز ہاتھ آجائے تو اس کو آنکھوں سے لگایا جاتا ہے، اور دل میں جگہ دی جاتی ہے، اور اگر کوئی اجنبی اور بیگانہ بھی راستہ گذرتے کوئی ایسی صدا لگا دیتا ہے جس سے منزل مقصود کی دریافت یا گوہر مقصود کے حصول میں ادنیٰ سی مدد ملتی ہے تو اس کو ہزار بار شکریہ کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے، علم وادب کی ترقی ہر زبان وادب اور ہر ملک و ملت میں

[1] رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۵ء

ان سب لوگوں کی رہین منت ہے، جنھوں نے اس کے خرمن میں ایک دانہ کا بھی اضافہ کیا یا اس کے گیسو سنوارنے یا گرد وغبار اور خس وخاشاک دور کرنے میں ہاتھ کا بھی اشارہ کیا، خود مغربی ممالک کے ادب وزبان اور فن تنقید کی تاریخ تشکر وممنونیت اور اقرار و اعتراف کے ان شریفانہ نمونوں سے لبریز ہے، جس کی تقلید وپیروی ہمارے مشرقی ممالک کے لیے معراج کمال اور ہمارے ادیبوں اور ناقدوں کے لیے سدرۃ المنتہیٰ بنی ہوئی ہے۔

اردو میں آب حیات کے بعد کوئی ایسا مسلسل ومکمل شستہ وشائستہ تذکرہ موجود نہیں تھا جو سلجھے ہوئے انداز اور سادہ وشیریں زبان میں اردو شعراء کے متعلق ایک متوسط درجہ کے طالب علم اور شائقِ فن کو بنیادی اور ضروری معلومات مہیا کرتا ہو، اس لیے جیسے ہی گل رعنا ملک کے موقر علمی ادارہ دارالمصنفین سے شایع ہوا، وہ ہاتھوں ہاتھ لی گئی، ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں کے اعلیٰ اردو نصاب میں داخل کی گئی، اس کے متعدد اڈیشن نکل چکے ہیں، اور ہندوستان وپاکستان میں یکساں طریقہ پر ایک اہم نصابی کتاب اور وقیع علمی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے پہلے گجرات میں علم حدیث

از مولانا عبداللہ سورتی صاحب دارالعلوم فلاح دارین، ترکیسر گجرات

"معارف کے گزشتہ شماروں میں، راقم کا جو حقیر مقالہ "شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے بعض امتیازی کارنامے" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، خوشی ہے کہ اس کو اہل علم نے دلچسپی اور توجہ سے پڑھا، بعض بزرگوں نے اس کی کمی اور کوتاہی کی جانب بھی توجہ مبذول فرمائی جس کے لئے میں ان کا ممنون ہوں، معارف کے ایک بڑے مخلص اور دیرینہ کرم فرما جناب شیخ نذیر حسین صاحب لاہور کا گرامی نامہ اس کے متعلق اکتوبر میں شائع ہو چکا ہے۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ایک لائق اور ذی علم استاذ مولانا برہان الدین سنبھلی نے مطلع فرمایا کہ شیخ کی عربی شرح "لمعات" ملتان سے چھپ گئی ہے۔ جزاہما اللہ خیر الجزاء۔

مولانا عبداللہ سورتی نے شیخ عبدالحقؒ سے پہلے کے علمائے گجرات کی خدمات حدیث پر یہ طویل مراسلہ تحریر فرمایا ہے، راقم کے مقالہ کا مقصد گجرات اور ساحلی علاقوں میں علم حدیث کی نشر واشاعت کی نفی وتردید نہ تھا، بلکہ شمالی ہند کے تعلق سے شیخ کی خدمات حدیث کو نمایاں کرنا اور یہ بتانا تھا کہ انھوں نے جس باقاعدگی اور اہتمام سے علم حدیث کا غلغلہ بلند کیا، اس کے درس وتدریس کا نظام قائم کیا اور اس میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع کیا اس کی مثال ان سے پہلے بڑی حد تک مفقود تھی۔ تاہم کوئی کلیہ مستثنیات سے

خالی نہیں ہوتا۔

اس صراحت و وضاحت کے باوجود ہمارے فاضل دوست نے اس پہلو کو مزید نمایاں کرنے کی ضرورت محسوس کی اور النور السافر اور نزہۃ الخواطر وغیرہ کی مدد سے یہ معلومات قلمبند کئے۔ ناظرین معارف کی دلچسپی اور واقفیت کے لئے ان کا مراسلہ مقالہ کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے" (ض)

اگست کا معارف (جلد ۱۳۲، عدد ۲) موصول ہوا، جس میں "شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے بعض امتیازی کارنامے" کے عنوان سے آں محترم کا قیمتی مقالہ بھی نظر سے گزرا۔ جزاکم اللہ خیرا

اس میں کوئی شک نہیں کہ محدث دہلویؒ نے درس حدیث اور کتب صحاح کو شمالی ہند میں عام کرنے میں زبردست خدمات انجام دی ہیں اور انہی کی مساعی جمیلہ سے دیگر صوبوں میں بھی حدیث شریف کا کافی چرچا ہوا۔

البتہ یہ دعویٰ کرنا کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سب سے پہلے وہ شخص ہیں جو عرب سے حدیث شریف کا سماع کر کے کتب حدیث لائے، اور ان سے پہلے ہندوستان میں صرف مشارق الانوار، مصابیح السنۃ اور مشکوٰۃ شریف ہی کا درس ہوتا تھا، درست نہیں۔

خصوصاً نواب صدیق حسن خانؒ کا یہ خیال کہ

"أن الهند لم يكن بها	ہندوستان میں اسلامی فتوحات کے
علم الحديث منذ فتحها	بعد ہی سے علم حدیث کبریت احمر کے
أهل الإسلام بل كان غريبا	مانند ناپید تھا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے
كالكبريت الأحمر حتى منّ	اس سرزمین پر اپنا فضل فرمایا ہے
الله تعالى على الهند بإفاضة	کے بعض علماء شیخ عبدالحق بن سیف الدین

هذا العلم على بعض علمائها	دہلویؒ وغیرہ کے ذریعہ اس علم
كالشيخ عبد الحق بن سيف الدين	سے اہل ہند کو متمتع کیا، یہی
الدهلوي وأمثالهم وهو أول	سب سے پہلے اس علم کو یہاں
من جاء به في هذا الإقليم	لائے اور اس کی نشر و
وأفاضه على سكانه في أحسن تقويم	اشاعت کی۔

تاریخی حقائق کے بالکل خلاف ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ گجرات کے شہر پٹن (نہروالا) احمد آباد، بھڑوچ اور سورت میں نویں صدی میں علم حدیث کا چرچا عام ہو چکا تھا، اور صوبہ گجرات کے علم پرور سلاطین (جو خود بھی حدیث پاک سے شغف رکھتے تھے) کی محنت اور کوشش سے عرب کے علماء کا ورود اور ان کا علمی فیضان جاری ہو چکا تھا۔

یہ بات کسی طرح درست نہیں کہ گجرات میں صرف تجرید، شفا، عطی وغیرہ کتب ہی کا درس جاری تھا۔ جہاں کتب فقہیہ اور عقلیہ کے ماہر علماء تشریف لائے وہاں علمائے حدیث و تفسیر بھی اس خطہ میں تشریف لا کر افادہ میں مشغول تھے۔

اسی نویں صدی کے نصف میں بخاری شریف کا درس احمد آباد میں جاری تھا اور ختم بخاری کی تقریب میں امیر وقت حاضر ہوتا تھا۔

(۱) شیخ عبدالقادر الحضرمی النور السافر میں تحریر فرماتے ہیں

"وفيها (أي في سنة ۹۷۴)	رجب ۹۷۴ھ میں امیر الغ خاں
في رجب كان ختم صحيح البخاري	کی موجودگی میں علامہ جمال الدین
عند الأمير الصالح الغ خان	ہبائی کی قرأت سے ختم بخاری

الحبشي بقراءة العلامة جمال الدين
محمد المهائمي بوعمل الغ خان
بختمه ضيافة عظيمة"

کی تقریب ہوئی، اس موقع پر
الغ خاں نے ایک بڑی دعوت
کا اہتمام کیا تھا۔

(۲) اس کے بعد ۹۷۵ھ کے واقعات کے ذیل میں لکھا ہے۔

ثم في ۹۷۵ھ كان ختم صحيح
البخاري بحضرة السيد الوالد..
... وأنشأ الشيخ عبد المعطي
باكثير في ذالك قصيدة الخ

پھر ۹۷۵ھ میں سید والا
کی موجودگی میں صحیح بخاری کے ختم
کی تقریب میں شیخ عبد المعطی
باکثیر نے ایک قصیدہ لکھا۔

ان دونوں عبارتوں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ختم بخاری شریف کی تقریب بہت اہتمام سے منائی جاتی تھی، جس میں امراء دعوت بھی کرتے تھے اور مشائخ اور فضلاء شرکت فرماتے تھے۔

(۳) سلطان احمد شاہؒ (م ۸۴۶ھ) کے تذکرے میں آتا ہے:-

اجتمع عنده اهل العلم من
كل ناحية من نواحي الأرض وصنفوا
له تصانيف منهم الشيخ بدر الدين
محمد بن ابي بكر الدماميني فانه صنف
له شرح التسهيل لابن مالك و
مصابيح الجامع وهو شرح البخاري

اس کے دربار میں تمام جگہوں کے علماء
موجود تھے جو اس کی فرمائش پر کتابیں
لکھتے تھے، ان میں شیخ بدرالدین محمد
ابن ابوبکر دمامینی بھی تھے جنھوں نے اس
کے لئے ابن مالک کی شرح التسہیل اور
بخاری کی شرح مصابیح الجامع تصنیف کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ ۸۴۶ھ سے قبل گجرات میں بخاری شریف کی شرح لکھ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔

(۴) شیخ ابوالقاسم بن احمد مکی (م ۹۲۵ھ) کے تذکرے میں لکھا گیا ہے!

ثم قدم الهند وسكن كجرات
مدة طويلة، قال الآصفي
في ظفر الواله انه دخل الهند
ومعه فتح الباري بخط ابيه و
عمه قدمه لبعض ملوكهم ...
الخ

یہ ہندوستان آئے اور ایک لمبی مدت
تک گجرات میں رہے، آصفی نے ظفر
الوالہ میں لکھا ہے کہ وہ اپنے ساتھ
فتح الباری کا ایک نسخہ بھی لائے تھے جو ان کے
والد اور چچا کے قلم سے لکھا ہوا تھا، اسی کو
انھوں نے یہاں کے کسی بادشاہ کو نذر کیا۔

لیجئے فتح الباری کا نسخہ بھی سب سے پہلے گجرات میں آیا ہے۔

(۵) سلطان مظفر شاہ حلیمؒ کے تذکرے میں آیا ہے۔

وقرأ على مجد الدين محمد بن محمد
الإيجي وعلى غيره من العلماء وأخذ
الحديث عنه وعن الشيخ جمال الدين
محمد بن عمر الحضرمي.

انھوں نے مجد الدین محمد بن محمد ایجی اور
دوسرے علماء سے کسب فیض کیا اور
ان سے اور محدث جمال الدین محمد بن عمر
حضرمی سے حدیث پڑھی۔

اور اسی مظفر شاہ حلیم کے تذکرے میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ

وكان يقتفي آثار السنة في
كل قول وفعل ويعمل بنصوص
الأحاديث النبوية الخ

یہ ہر قول وفعل میں سنت کا تتبع
کرتے تھے اور روایاتِ حدیث
ہی پر عمل کرتے تھے۔

توجس علاقے میں سلطانِ وقت حدیث پاک سے اس درجہ شغف رکھتے ہوں اور جہاں عرب وعجم کے علماء بڑی تعداد میں موجود ہوں وہاں علم حدیث کے کبریت احمر ہونے کے کیا معنی؟

نیز شیخ عبدالقادر الحضرمی نے النور السافر ہی میں عبدالحلیم خداوند خاں کے تذکرے میں لکھا ہے:

فانّ سورت فی أیامہ السعیدۃ	ان مبارک ایام میں سورت
کانت طافحۃ بالمشائخ والفضلاء	مشائخ وفضلاء اور ہر طبقہ کے
ومشحونۃ باکابر الناس من سائر الاجناس	اکابر کا مرکز تھا

ان واضح تاریخی شہادتوں کے بعد بھی یہ دعویٰ کرنا کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے قبل ہندوستان میں علم حدیث کا چرچا نہیں تھا یا اگر کہیں درس ہوتا تھا تو وہ اِکّا دکّا واقعہ ہے، صحیح نہیں ہو سکتا۔

مولانا سید عبدالحی حسنیؒ تحریر فرماتے ہیں:

حتی منّ اللہ علی الھند بافاضۃ	پھر اللہ تعالیٰ نے اس علم کا فیضان ہندوستان
ھذا العلم فورد بعض العلماء	پر جاری کیا جس کی بدولت دسویں صدی
فی القرن العاشر کالشیخ عبدالمعطی	میں یہاں بعض علماء کی آمد ہوئی جیسے
بن حسن بن عبداللہ باکثیر المکی	شیخ عبدالمعطی بن حسن بن عبداللہ
المتوفی بأحمد آباد (۹۸۹ھ)	باکثیر مکی، متوفی ۹۸۹ھ، شیخ
والشیخ احمد بدرالدین المصری	احمد بن بدرالدین مصری، متوفی
المتوفی بأحمد آباد (۹۹۲ھ) و	۹۹۲ھ اور شیخ محمد بن احمد الحنبلی
الشیخ محمد بن احمد الحنبلی	متوفی ۹۱۹ھ، ان تینوں بزرگوں نے
المتوفی بأحمد آباد (۹۱۹ھ)	احمد آباد میں وفات پائی۔

(الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند ص ۱۳۶)

دوسری جگہ رقمطراز ہیں:

وبعض العلماء وفدوا	بعض علماء گجرات آئے اور درس و
الی ارض گجرات ودرسوا	افادہ کا سلسلہ جاری کیا، جیسے شیخ
وأفادوا کالشیخ عبدالمعطی	عبدالمعطی مکیؒ، شیخ عبداللہ اور شیخ
المکی والشیخ عبداللہ والشیخ	رحمت اللہ وغیرہ، چنانچہ لوگوں نے ان سے
رحمۃ اللہ وغیرھم فأخذ	استفادہ کیا اور اس طرح اس خطہ میں اس
الناس عنھم وانتشر العلم	پاکیزہ علم کی نشر و اشاعت ہوئی۔
الشریف فی تلک الناحیۃ (الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند ص ۱۳)	

شیخ عبدالمعطی المکیؒ کی ولادت مکہ مکرمہ میں ہوئی اور وہاں ہی ان کی تعلیم و تربیت ہوئی، ان کی علمی جلالت شان کے بارے میں مولانا سید عبدالحی حسنیؒ کی شہادت ہے کہ:

"من شیوخہ شیخ الاسلام	ان کے ایک استاد شیخ الاسلام زکریا
زکریا الانصاری لانہ سمع	انصاری ہیں جن سے انھوں نے اپنے
منہ صحیح البخاری بقراءۃ	والد کی قرأت سے محدثین کی اصطلاح
والدہ وھو یرویہ عنہ	سماع کے مطابق صحیح بخاری کی سماعًا
سماعًا کمافی اصطلاح اھل	روایت کی ہے اور شیخ زکریا نے
الحدیث والشیخ زکریا یرویہ	شیخ الاسلام حافظ ابن حجر سے روایت
عن شیخ الاسلام الحافظ	کی ہے، اس بنا پر صاحب تذکرہ
ابن حجر العسقلانی ولھذا	اپنے عہد میں عالی سند کے
اشتھر صاحب الترجمۃ فی	حامل سمجھے جاتے تھے اور اس میں
زمنہ بالسند العالی وتمیز	اپنے معاصروں سے ممتاز تھے۔

بین أقر انه بذلك فازدحم
الناس علی الأخذ منه وصارله
من الحظ بسبب ذلك مالا
مزید علیه ... الخ

اسی خصوصیت کی بنا پر
طالبانِ علم کا غیر معمولی
ازدحام ان کے یہاں
ہوتا تھا۔

(نزهة الخواطر ج ۴ ص ۲۱۵)

مولانا کے الفاظ فازدحم الناس علی الأخذ منه بتاتے ہیں کہ حدیث شریف کی اس عالی سند کے سبب تشنگانِ علوم نبوت بڑی تعداد میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور علمی پیاس بجھاتے تھے۔

اوپر ہم نے حدیث شریف سے سلطان مظفر شاہ حلیم کے لگاؤ کا ذکر کیا تھا، اب سلطان محمود بن محمد بیگڑہ (۸۶۱ھ ۔ ۹۱۷ھ) کا حال سنئے، حکیم سید عبدالحی حسنیؒ ہی تحریر فرماتے ہیں:

"من مکارمه قیامه بتربیة
العلماء والصالحین لما کان
مجبولا علی حب العلم واهله
فاجتمع فی حضرته خلق کثیر
من افاضل العرب والعجم حتی
صارت بلاد گجرات عامرة آهلة
بالعلماء ووفد علیه المحدثون
من بلاد العرب واقبل الناس
الی الحدیث الشریف فتشابهت

علماء اور صلحاء کی کفالت اس کا نمایاں
وصف تھا، علم دوستی اور علماء سے
محبت اس کی فطرت میں داخل
تھی، اس کے دربار میں عرب و عجم
کے فضلاء کا ایک بڑا مجمع رہتا تھا،
جس کی بنا پر گجرات علماء سے
معمور ہوگیا تھا، بلاد عرب
سے محدثین بھی وہاں وارد ہوئے
جن سے لوگوں نے علم حدیث

بالیمن المیمون وفاقت
علی سائر بلاد الهند فی ذلك.
وقد وفد علیه العلامة
جمال الدین محمد بن محمد
المالکی المصری فأدناه وقربه
الیه ووکله علی ولایة الجزیة
فی سائر بلاده ولقبه
بملك المحدثین وهو اول
من لقب بها فی بلاد الهند ... الخ

سیکھا، گویا گجرات یمن کے مانند
ہوگیا تھا اور اسے ہندوستان کے
تمام شہروں پر فوقیت حاصل ہوگئی تھی۔
ان واردین میں علامہ
جمال الدین محمد بن محمد مالکی مصری بھی
تھے جو سلطان کے بڑے مقرب تھے، سلطان
نے انھیں پورے ملک میں محکمۂ جزیہ کا حاکم
مقرر کیا تھا اور انھیں ملک المحدثین کے لقب سے
نوازا تھا، یہ وہ پہلے شخص ہیں جنھیں ہندوستان
میں یہ لقب ملا۔

اسی طرح شیخ عبداللہ المتقی السندی کے تذکرے میں لکھا ہے:۔

"لم یکن فی زمانه أعلم منه
بالحدیث والتفسیر، رحل
الی گجرات وصحبه القاضی
عبد الله بن ابراهیم السندی
۹۲۷ھ، ثم سافر الی الحرمین
الشریفین وسکن بالمدینة
المنورة مدة طویلة ثم رجع
الی الهند صحبة الشیخ رحمة الله

ان کے عہد میں ان سے بڑا کوئی حدیث
و تفسیر کا عالم نہ تھا، یہ قاضی عبداللہ بن
ابراہیم سندی متوفی ۹۲۶ھ کی معیت
میں گجرات آئے، پھر انھوں نے حرمین
شریفین کا قصد کیا اور مدینہ منورہ میں
ایک لمبے عرصہ تک مقیم رہ کر شیخ
رحمت اللہ سندی ۹۷۷ھ کی معیت
میں ہندوستان واپس ہوئے،

السندی (۹۶۷۷) و اقام بگجرات زماناً

اور ایک زمانے تک گجرات میں مقیم رہے۔

اب بعض دیگر علماء کا حال ملاحظہ فرمادیں ... مولانا سید عبدالحیٔ حسنیؒ تحریر فرماتے ہیں

(۱) الشیخ العالم المحدث احمد بن محمد النهروانی (م ۹۴۹) و هو والد المفتی قطب الدین محمد النهروالی أخذ الحدیث عن الشیخ عزالدین عبدالعزیز بن نجم الدین عمر بن محمد وعن جماعة من ائمة الحدیث وله سند عال لصحیح البخاری

شیخ محدث احمد بن محمد النہروانی متوفی ۹۴۹ھ، مفتی قطب الدین محمد النہروانی کے والد اور شیخ عزالدین عبدالعزیز بن نجم الدین عمر بن محمد اور دوسرے ائمہ حدیث کے شاگرد ہیں۔ ان کی صحیح بخاری کی سند بہت عالی تھی۔

(۲) الشیخ العالم جمال محمد بن مالکؒ سافر الی الحرمین و کان عالماً بارعاً فی الحدیث (م ۹۹۸)

شیخ جمال محمد بن مالکؒ (م ۹۹۸ھ) نے حرمین کا سفر کیا تھا اور حدیث کے بڑے زبردست عالم تھے۔

(۳) الشیخ عبدالملک البیانی العباسی الأحمد آبادی کے تذکرے میں یہ الفاظ قابل غور ہیں۔

أحد کبار العلماء، کان حافظاً للقرآن الکریم و صحیح البخاری لفظاً و معنی وکان یدرس عن ظهر قلبه

یہ کبار علماء میں شمار کئے جاتے تھے، وہ قرآن مجید اور صحیح بخاری کے لفظاً و معناً حافظ تھے اور درس زبانی دیتے تھے،

اس سے ثابت ہوا کہ صرف بخاری شریف کے جاننے والے ہی نہیں بلکہ اس کے حافظ بھی گجرات میں موجود تھے اور اس کا زبانی درس دیتے تھے۔

(۴) شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ سے پہلے علمائے گجرات میں شیخ راجح بن داؤدؒ اور ان کے بھائی کو براہ راست علامہ سخاویؒ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ ان دونوں بھائیوں نے ۸۹۴ھ میں حرمین شریفین کا سفر کیا اور علامہ سخاویؒ سے سند حاصل فرمائی جس کی پوری تفصیل الضوء اللامع ج ۳ ص ۲۲۴ پر موجود ہے۔ دونوں بھائی جب حرمین شریفین کے سفر سے واپس آئے تو گجرات میں آخر عمر تک علمی خدمات انجام دیتے رہے، مولانا عبدالحیؒ کے الفاظ ہیں:

فاستقبله الناس استقبالاً عظیماً فدرس وأفاد حتی توفی فی سنة ۹۰۴ھ

لوگوں نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا، چنانچہ انھوں نے وہاں درس و افادہ کا سلسلہ قائم کیا اور سنہ ۹۰۴ھ میں وفات پائی۔

اسی طرح علامہ شیخ بن عبداللہ العیدروسی الحضرمی ثم الأحمد آبادی کے تذکرہ میں لکھا ہے:

أخذ عن الشیخ شهاب الدین احمد بن حجر الهیثمی، والعلامة عبدالله بن احمد الفاکهی واخیه عبدالقادر، والعلامة عبدالرؤف بن یحیی والعلامة محمد بن الخطاب المالکی ولازم هؤلاء المذکورین حتی

انھوں نے شیخ شہاب الدین احمد بن حجر ہیثمی، علامہ عبداللہ بن احمد الفاکہی، ان کے بھائی عبدالقادر، علامہ عبدالرؤف بن یحییٰ اور علامہ محمد بن خطاب مالکی سے استفادہ کیا، اور ان بزرگوں کی خدمت میں رہ کر تفسیر و حدیث میں نمایاں

برع فی التفسیر والحدیث — درجہ حاصل کیا۔

جو محدث اتنے عظیم علمائے حدیث و تفسیر سے استفادہ کر کے گجرات آیا ہو کیا اس کا درس مشارق الأنوار تک محدود رہا ہوگا؟

آخر میں یہ بھی ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شیخ محدث عبد الحق دہلوی نے خود گجرات کے بعض اساتذۂ حدیث سے استفادہ کیا ہے، مولانا عبد الحی حسنی نے تصریح فرمائی ہے:۔

الشیخ عبد الحق أخذ الحدیث	شیخ عبد الحق نے حدیث کا علم شیخ
عن الشیخ عبد الوهاب البروجی	عبد الوہاب بھڑوچی سے سیکھا تھا، جو علی متقی
احد أصحاب علی المتقی (نزهة الخواطر ج۵ ص۲۰۳)	کے شاگرد تھے۔

ان کے دوسرے استاذ شیخ عبد اللہ فتح اللہ البروجی الگجراتی ہیں جن کے بارے میں مولانا نے تحریر فرمایا ہے:

الشیخ العالم عبد الله فتح الله	شیخ عبد اللہ فتح اللہ بھڑوچی گجراتی شیخ متقی
البروجی الگجراتی احد أصحاب	کے شاگرد ہیں، انھوں نے مکہ مکرمہ کا
الشیخ المتقی سافر الی مکة المکرمة	سفر کیا تھا اور ایک لمبی مدت شیخ متقی
ولازم الشیخ المذکور ملازمة	کی معیت میں بسر کی تھی اور ان ہی سے
طویلة وأخذ عنه الحدیث	حدیث پڑھی، پھر ان سے شیخ عبد الحق اور
... وأخذ منه الشیخ عبد الحق وخلق کثیر	دوسرے لوگوں نے یہ علم پڑھا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مذکورہ تمام عبارتوں اور تاریخی شہادتوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شیخ محدث عبد الحق سے پہلے بھی گجرات میں بخاری شریف کا درس ہوتا تھا اور علم حدیث کے ماہر علماء عرب سے یہاں آتے تھے جن میں مکہ کے علاوہ یمن اور حضر موت کے بھی تھے، نیز شیخ دہلوی سے بہت پہلے یہاں کے علماء حرمین شریفین کا سفر کر کے علم حدیث حاصل کر چکے تھے اور مشہور اساتذۂ حدیث سے سندیں لے چکے تھے، فتح الباری شرح بخاری کا نسخہ بھی گجرات آچکا تھا۔ واللہ اعلم بالصواب

تحریک رابطۂ قلمیہ کا تنقیدی مطالعہ

از

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی پروفیسر صدر شعبۂ عربی کالی کٹ یونیورسٹی کیرالا

رابطۂ قلمیہ ایک عظیم ادبی تحریک ہے جس کا مقصد ادب میں حریت پسندی اور زندگی کی ترجمانی تھا، اس تحریک نے دار الہجرۃ میں (جس کو جدید عربی اصطلاح میں مہجر کہتے ہیں) نشو و نما پایا۔ اس نے عربی شعر و ادب میں جدیدیت کی پر زور حمایت کی۔ تقلید و روایت کے بندھن توڑ کر نئی مغربی قدروں سے عربی ادب کو روشناس کرایا اور نہ صرف نظریاتی طور پر قدامت کی مخالفت کی بلکہ عملی طور پر نثر و نظم میں عظیم ادبی ذخیرہ یادگار چھوڑا۔ ظاہر ہے کہ اس تحریک نے عربی ادب میں جدیدیت کو تقویت پہونچائی اور اس کے عمل کو تیز سے تیز تر کر دیا۔ اس بنا پر اس تحریک کا مطالعہ جدید عربی ادب کی تاریخ کا ایک جزو لاینفک ہے۔

۲۰ اپریل ۱۹۲۰ء کی شام کو ممتاز مہجری ادبا عبد المسیح حداد کے گھر پر نیویارک میں جمع ہوئے تا کہ ایک ادبی تحریک کی تاسیس کے بارے میں غور و فکر کریں۔ دوبارہ پھر ۲۸ اپریل ۱۹۲۰ء کو مندرجہ ذیل اصحاب قلم جمع ہوئے:۔

۱۔ جبران خلیل جبران، ۲۔ عبد المسیح حداد، ۳۔ میخائیل نعیمہ، ۴۔ ندرہ حداد، ۵۔ ایلیا عطار اللہ، ۶۔ ولیم کاتسفلیس، ۷۔ نسیب عریضہ، ۸۔ رشید ایوب۔

مذکورہ بالا ادیبوں نے رابطۂ قلمیہ کی تاسیس میں حصہ لیا اور اس کے لئے مندرجہ ذیل

اصول و قوانین مرتب کئے :-

۱۔ اس جمعیت کا نام "الرابطة القلمية" ہوگا۔

۲۔ اس کے تین عہدیدار ہوں گے۔ صدر، سکریٹری اور خازن (متنشار، عمید اور خازن)

۳۔ اس کے ارکان تین طرح کے ہوں گے عمال (کام کرنے والے) ۲۔ انصار (مددگار) ۳۔ المراسلون (نمائندے)

۴۔ انجمن ارکان اور دوسرے لوگوں کے عمدہ ادبی کاموں کو شائع کرے گی اور غیر ملکی ادب کے ترجمہ کو بھی چھاپے گی۔

۵۔ ادیبوں اور شاعروں کو انعام بھی دے گی۔

جبران عمید (سکریٹری) میخائیل نعیمہ متنشار (صدر) اور ولیم کاتسفلیس خازن منتخب ہوئے۔ بعد میں ایلیا ابوماضی اور ودیع باحوط اس میں شریک ہوئے۔ اس بنیادی تشکیل کے بعد دستور سازی کا کام میخائیل نعیمہ کے سپرد ہوا۔ خلیل جبران چونکہ ادیب و شاعر کے علاوہ ایک بڑے مصور بھی تھے لہذا انھوں نے اس تحریک کا "نشان" بنایا جس میں ایک دائرہ تھا، اس کے درمیان ایک کھلی ہوئی کتاب تھی جس کے دونوں صفحات پر مندرجہ ذیل عبارت لکھی تھی۔

"لله كنوز تحت العرش مفاتيحها ألسنة الشعراء"

(عرش کے نیچے اللہ کے خزانے ہیں جن کی کنجیاں شعراء کی زبانیں ہیں)

اس نشان کے نصف اعلیٰ پر سورج کی کرنیں پڑ رہی تھیں اور نصف اسفل کے دو حصے تھے، آدھے داہنے حصہ میں قلم تھا جس سے بلند بن گیا تھا اور آدھے داہنے حصہ میں چراغ

بنا تھا اور خط کوفی کے دائرہ کی طرح اس میں الرابطۃ القلمیہ لکھا تھا اور اس چراغ سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔[1]

۱۹۲۱ء میں جبران خلیل اور میخائیل نعیمہ کی ادارت میں الرابطۃ القلمیہ کا ایک ادبی مجموعہ شائع ہوا جس میں اس کے تمام ارکان کے مضامین تھے۔ ہر مضمون کے آخر میں مقالہ نگار کے بارے میں لکھا رہتا تھا۔ "العامل فی الرابطۃ القلمیہ"۔ اس مجموعہ میں ادبی، لسانی، معاشرتی اور فلسفیانہ انداز نظر کے حامل مقالات شائع ہوتے تھے۔ اس لئے کہ ان ادباء کا یہ اعتقاد تھا کہ ادب زندگی کا آئینہ اور اس کے پیش کرنے کا ذریعہ ہے نفس انسانی اور روح انسانی کی اہمیت ان مہجری ادیبوں کی نظر میں بنیادی ہے۔ میخائیل نعیمہ نے لکھا ہے کہ "ادبی اقدار کا حامل ادب کبھی نہیں مرتا اور مردہ ادب کبھی نہیں زندہ رہتا، ادبی آثار میں ابدیت اسی کو حاصل ہوتی ہے جس میں ابدی روح کا کچھ حصہ شامل ہو؟"

جبران نے اس مجموعہ کو شعر منثور سے شروع کیا جس کا عنوان رکھا "بین لیل وصباح" اس مقالہ میں وہ کہتا ہے کہ اس کا یقین و اعتقاد یہ ہے کہ روح جسم انسانی کے فنا ہونے کے بعد پھر آسمان سے نیچے آتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عقیدہ تناسخ کو مانتا تھا۔ اس نے مثلاً ابن سینا کے قصیدۂ نفس کا یہ مطلع بھی پیش کیا ہے کہ

هبطت إليك من المحل الأرفع   ورقاء ذات تعزز وتمنع

(ترجمہ، بلندی سے تیری طرف ایسی کبوتری (نفس انسانی) اتری جو عزت و اکرام کی حامل ہے۔

اس اعتقادی گمراہی کے ساتھ ساتھ بنی نوع انسان کی ہمدردی سے یہ مجموعۂ مضامین لبریز تھا

ایلیا ابوماضی کے یہ اشعار اس کیفیت کی غمازی کرتے ہیں :-

ماذا يفيد الصوت مرتفعا   ان لم يكن للصوت ثم صدى

[1] شعراء الرابطۃ القلمیہ ص ۸۶

و النور مغتبق و منتشر ان لم یکن للناس فیہ ھدیٰ

(ترجمہ) بلند آواز کیا نفع پہونچا سکتی ہے اگر اس آواز میں بازگشت نہ ہو، وہ روشنی پراگندہ ہے جس میں لوگوں کے لیۓ ہدایت کا سامان نہ ہو۔

جب یہ مجموعہ ادبی حلقوں میں پہونچا تو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ رسالوں نے اس کے مضامین نقل کیۓ۔ ادباء و شعراء نے اس کی تقلید کی۔ ان مہجری ادیبوں کی عظمت ان کے اسلوب و خیالات کی گہرائی اور تشبیہات کی ندرت میں ظاہر ہوئی۔ ابولو مدرسہ فکر نے بھی اس کو اپنایا، منفلوطی اور رافعی نے باوجود قدامت پرست ہونے کے اس مجموعہ کی ادبیت کو بہ نظر استحسان دیکھا مگر خفاجی کی اس رائے سے میں متفق نہیں ہوں کہ ان دونوں نے مہجری ادیبوں کا اتباع کیا[1]۔ یہ تصور صحیح نہیں، منفلوطی اور رافعی فطری ادیب تھے اور صاحب اسلوب تھے، انھوں نے کسی کا اتباع نہیں کیا۔

اس موقع پر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ ایک اہم طبقہ نے ان مہجری ادیبوں کی مخالفت کی جن میں سرفہرست مشہور باغی اور تجدد پسند ادیب ڈاکٹر طہٰ حسین ہیں۔ ڈاکٹر عبدالمنعم خفاجی کا یہ خیال صحیح نہیں کہ یہ مخالفت روایت پرست اور تقلید کے حامیوں نے کی اس لیۓ کہ طہٰ حسین تو مشہور آزاد خیال ہیں۔ بعض مصری ادیبوں نے جب اس شاعری کا جائزہ لیا جو مہجر میں پروان چڑھی تھی تو انھوں نے محسوس کیا کہ ان حضرات نے صَرف کے معروف مشتقات کا لحاظ نہیں کیا ہے۔ انھوں نے معروف بحروں کو نظر انداز کیا ہے بلکہ وزن کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔ نحو و صرف میں بے جا تصرفات کیۓ ہیں۔ ڈاکٹر طہٰ حسین جو خیالات میں تجدد مگر زبان میں پختگی کے قائل ہیں انھوں نے مہجری ادب پر سخت نکتہ چینی کی۔ انھوں نے ایلیا ابوماضی کے دیوان "الجداول" پر سخت

[1] یہ رائے عبدالمنعم خفاجی نے "قصۃ الادب المہجری" میں ظاہر کی ہے۔

تنقید کی۔ جبران اس تنقید پر خاموش نہ رہ سکے انھوں نے دلکش انداز سے طہٰ حسین کے نظریہ کی مخالفت کی مگر پُرزور طریقہ سے۔ اس پس منظر میں انھوں نے مخالفین کے بارے میں اور اپنی مدافعت میں یہ اشعار نظم کیۓ:۔

لوموا و سبوا والعنوا واسخروا و ساوروا ایامنا بالخصام

(ترجمہ) گالی گلوج کرو، لعنت ملامت کرو، مذاق اڑاؤ اور لڑائی جھگڑا کرو۔

فنحن کوکب لا یسیر الی الوراء فی النور او فی الظلام

ہم ایسے ستارے ہیں کہ جو پیچھے کی طرف نہیں چلتے خواہ روشنی ہو خواہ ظلمت۔

میخائیل نعیمہ نے صحیح لکھا ہے کہ ان مخالفین کا انتقام رابطہ قلمیہ کے ادیبوں کو قوت و عظمت عطا کر رہا تھا اس کے مددگار بڑھ رہے تھے اور اس کو مستحسن سمجھنے والوں کی تعداد میں ہر عرب ملک میں اضافہ ہو رہا تھا حتیٰ کہ اس کی ترقی کے متعلق اس کے مؤید اور معارض دونوں متحیر رہ گئے، ان کو اس تحریک کے اثرات اور قوت کا راز نہ معلوم ہو سکا۔ بعضوں نے کہا کہ اس تحریک کی عظمت کا راز امریکی ادب ہے، یہ قول حقیقت سے بالکل خالی ہے۔ کسی نے کہا کہ امریکی معاشرہ کی حریت نے اس کو اس لائق بنایا، یہ بھی بے اصل ہے۔ بعضوں نے یہ رائے دی کہ ان لوگوں نے عربی زبان کے اصول و قواعد کی مخالفت کی ہے، یہ تو مذکورہ دونوں آراء سے بھی ضعیف تر ہے۔

اس تحریک کی قوت کا راز صرف اسی کو معلوم ہے جس نے ان ادیبوں کو غربت میں ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا اور خاص وقت میں ان کو ساتھ لیا اور ہر شخص کے سینہ میں ایک ایسی چنگاری رکھ دی جو دوسرے سینہ کے اندر رکھی ہوئی چنگاری سے حرارت و حسن میں مختلف تھی اگرچہ ان سب کو جلانے والی شمع ایک ہی تھی[1] یعنی خلیل جبران کی شخصیت۔

[1] کتاب جبران خلیل جبران از میخائیل نعیمہ ص ۱۸۲

حق یہ ہے کہ عربی ادب میں رابطۂ قلمیہ پہلا مدرسۂ فکر ہے جو منظم انداز سے شروع ہوا اس نے تجدد کو اپنا شعار بنایا، اور پوری جرأت اور فن کارانہ انداز سے ایک نیا پیغام دیا، یہ ایک ایسا عملی پیام تھا جس کی مثال سے عربی ادب کا دامن خالی ہے، اگرچہ روحانیت کے اثر سے تجدد کا دھارا مصر و شام اور دوسرے علاقوں تک پہونچا مگر تقلید اور روایتی اندازِ فکر سے ادبار گگو خلاصی حاصل نہ کر سکے اس لئے کہ یہ لوگ مدح، فخر، مرثیہ، غزل اور تہنیت وغیرہ جیسے موضوعات پر طبع آزمائی کرتے رہے، حافظ، شوقی، مطران، فارس شدیاق، مارون نقاش وغیرہ نے تجدد کی لہروں کو محسوس کیا مگر قدامت سے اپنا دامن چھڑا نہ سکے۔

ہجری ادب میں میخائیل نعیمہ نے تنقیدی انداز سے اس ادب کی تشریح اور تفسیر میں دو کتابیں تصنیف کیں جو اس جدید رجحان کی صحیح ترجمانی کرتی ہیں۔ پہلی منکرانہ تنقیدی کتاب جو ۱۹۲۲ء میں مصر سے شائع ہوئی وہ ہے "الغربال" (چھلنی) اس میں انھوں نے ادب کے جدید پیمانوں کو وضاحت سے پیش کیا، یہ کتاب ہجری ادب کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ دوسری کتاب خلیل جبران کی سوانح عمری ہے جو میخائیل نعیمہ نے جبران خلیل جبران کے نام سے تصنیف کی ہے۔ یہ کتاب بھی اس عظیم مصنف، صاحبِ فن اور تحریک رابطۂ قلمیہ کے میر کارواں کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔

ان ہجری ادیبوں نے تنقید کو اپنا موضوع بہت کم بنایا ہے۔ انھوں نے اپنی کاوشوں سے ادب کو نیا رخ عطا کیا ہے، ان ادیبوں اور شاعروں نے کثرت سے دواوین شائع کئے۔ طویل طویل نظمیں تصنیف کیں، بڑی تعداد میں رسالے شائع کئے، ناول اور قصے لکھے، انشائیے اور مقالے پیش کئے۔ غرض ادبیات کا انبار لگا دیا۔ ان تمام ادبی اصناف میں انہوں نے تجدد کو پوری قوت سے پیش کیا اور قدامت و روایت پر ضرب کاری لگائی۔

ہجری شعراء نے مدح و مرثیہ کو ہاتھ نہیں لگایا، انہوں نے زندگی کی وسعتوں، اس کے

مسائل، انسانی افکار، جذبات، احساسات اور دل کی زبان کو اپنایا اور انسانیت کو مخاطب کیا، انہوں نے فلسفۂ غم و الم کو اپنایا اور زندگی میں غموں کا سرور محسوس کیا۔ جبران نے "دمعۃ و ابتسامۃ" میں ناکامیوں سے کام لینے کا فلسفہ پیش کیا ہے۔

ہجری ادیبوں میں سے ہر ایک نے اپنا عالمِ خیال خود وضع کیا، اس نے غور و فکر کے ساتھ اپنی دنیا بنائی اس نے نفسِ انسانی کے مطالعہ کو اپنا مطمحِ نظر قرار دیا۔ انسانی زندگی کے اسرار، انقلابات، تغیرات اور روحانی انعکاسات اس کو مبہوت و متحیر کرتے رہے۔ انھیں کیفیات سے شک و سوال کے دروازے کھلے، ان لوگوں نے نفس کے بارے میں نظمیں لکھیں اور ان میں خیالات اور تجربات پیش کئے۔

یا نفس لولا مطمعي بالخلد ما كنت اعي

لحنا تغنيه الدهور

اے نفس اگر میرا مقصد ابدیت نہ ہوتا تو میں وہ نغمہ نہ اپناتا جس کی جانب زمانے متوجہ ہوتے ہیں۔

میخائیل نعیمہ نفس کو اس طرح مخاطب کرتا ہے:

أيه نفسي انت لحن فيّ قد رنّ صداه وقعته يد فنان لا أراه

اے نفس تو ایک نغمہ ہے جو میرے اندر پوشیدہ ہے جس کی آواز بازگشت لطیف ہے جس کی نغمہ سازی ایک ایسے ہاتھ نے کی ہے جس کو میں دیکھ نہیں رہا ہوں۔

انت ريح و نسيم انت موج وانت بحر انت برق انت رعد انت ليل انت فجر

تو ہوا ہے، نسیم ہے، موج ہے، سمندر ہے، رعد و برق ہے، رات اور فجر ہے، (یعنی سارے مظاہرِ فطرت کی کیفیات خود نفسِ انسانی میں عیاں ہیں)

ان شعراء نے شک کی راہ اپنائی۔ ان کے سامنے انسانی روح اصل سوال تھا، اس کا جواب انہوں نے ابن سینا اور ابو العلاء المعری کے شکوک اور کبھی امام غزالی اور ابن الفارض کے متصوفانہ تخیلات میں پایا مگر در اصل یہ اہل فن خیر و شر، نور و ظلمت، حق و باطل اور بہت سے بنیادی مسائل میں غور و فکر کرتے ہیں اور حق کی تلاش میں فکر سے کام لیتے ہیں مگر چونکہ ان کا فکر تشکک آمیز ہے اس لئے راہ حق ان کے سامنے کبھی واضح نہ ہو سکی ورنہ کوئی معقول آدمی تناسخ جیسے عقیدہ کو نہ اپناتا، تشاؤم اور تناسخ کو ان شعراء نے اپنایا اور تحیّر میں عمر گزاری ان کے تشکک کا یہ عالم ہے کہ میخائیل نعیمہ اعتراف کرتے ہیں کہ شیطان میرے دل میں داخل ہو گیا ہے اور طوفان برپا کئے ہوئے ہے۔

دخل الشیطان قلبی فرأی فیہ ملاک　　فیلیح الطرف ما بینہما اشتد العراک

ذا یقول: البیت بیتی فیعید القول ذاک　　وانا اشہد ما یجری ولا ابدی حراک

شیطان میرے قلب میں داخل ہو گیا تو اس نے وہاں ایک فرشتہ دیکھا، فوراً دونوں میں شدید معرکہ شروع ہو گیا، ایک کہتا ہے کہ یہ گھر میرا گھر ہے، دوسرا بھی یہی قول دہراتا جو کچھ اندرون قلب جاری ہے اس کو میں دیکھتا ہوں مگر جنبش نہیں کرتا

یہ تشکیک اس حد تک بڑھی کہ ان شعراء نے ہر شئی کو شک کی نظر سے دیکھا حتی کہ موت و حیات تک میں شک کرنے لگے، نسیب عریضہ کہتا ہے:-

لماذا نحس لماذا نحب　　لماذا نعیش بلا طائلہ

ہم کیوں محسوس کرتے ہیں، ہم کیوں محبت کرتے ہیں ہم کیوں جیتے ہیں بغیر کسی فائدہ کے۔

لماذا التناسل ونسل ندری　　بان الحیاۃ لہ قاتلہ

ہم کیوں افزائش نسل کرتے ہیں یہ جانتے ہوئے کہ زندگی (آنے والی نسلوں کو) قتل کرنے والی ہے۔

ولماذا غلام یموت وتبقی　　شیوخ تثقل فی العائلہ

بچے کیوں مر جاتے ہیں اور بوڑھے خاندان پر بوجھ بن کر جیتے رہتے ہیں۔

ان شعراء نے یہ خیال قائم کیا کہ ایک ایسی دنیا آسمان پر ہے جو ہماری مادی دنیا سے بالکل مختلف ہے، اس میں اس عالم ناسوت کے مصائب و محن موجود نہیں۔ وہاں ہر طرف امن و آشتی، محبت و شفقت اور دلکشی و دلجوئی کی فضا ہے۔ اس تصور کا مرجع ان مہجری شعراء کے وہ دنیاوی مصائب و آلام ہیں جنھوں نے ان کو مجبور کر دیا کہ یہ اپنے تخیل میں رومانیت پسندی کے ذریعہ ایک ایسے عالم کو جنم دیں جس میں ان دنیاوی مصائب کے بجائے ہر طرف خوشی و محبت کی فضا ہو۔

جبران نے اس تخیلی دنیا کا نام "البلاد المحبوبۃ" (محبوب ملک) رکھا تھا اگرچہ خود ان کو بھی اس کے وجود پر شک تھا۔ وہ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں!

وطلبناک برکب او علی　　متن سفن او بخیل وجمال

ہم نے تجھ کو سواری سے، سفینہ سے گھوڑے اور پیدل چل کر تلاش کیا (مگر نہیں پایا)

لست فی الشرق ولا الغرب ولا　　فی جنوب الارض او نحو الشمال

تو نہ مشرق میں ہے اور نہ مغرب میں نہ جنوب میں نہ شمال میں

لست فی الجو ولا تحت البحار　　لست فی السہل ولا الوعر الحرج

(اے عالم محبوب) تو نہ فضاؤں میں ہے، نہ سمندروں میں اور نہ نچلی زمینوں میں اور نہ تنگ اونچی زمینوں میں۔

انت فی الارواح انوار و نور　　انت فی صدری فؤادی یختلج

تو انسانی روحوں کی روشنی ہے، تو میرے سینہ میں ہے اور درونِ دل ہے۔

میخائیل نعیمہ بھی اسی انداز سے سوچتے ہیں، تصور کرتے ہیں کہ یہ حسین و دلکش عالم خیال خود ان کے نفس کے اندر پوشیدہ ہے۔ ایلیا ابو ماضی اسی عالم خیال کا نام " نار القریٰ[1] " مہمان کا الاؤ رکھتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ اس تک پہونچنا نہایت دشوار گزار ہے:

کیف الوصول الیک یا نار القریٰ   انا فی الحضیض وانت فی الجوزاء

اے آتش مہمان نواز! تجھ تک کس طرح پہونچا جائے، میں نچلے حصہ میں ہوں اور تو برج جوزا کی بلندی پر ہے۔

لی الف باصرۃ تحن کما تری   لکن دونک الف الف غطاء

میری ہزاروں نگاہیں تیرے لئے مشتاق ہیں مگر تیرے اوپر ہزاروں پردے پڑے ہیں۔

نسیب عریضہ نے اس عالم خیال کے خوب خوب گن گائے ہیں۔ ان شعراء نے عالم علوی کے حسین تصور میں غم روزگار سے پناہ حاصل کی ہے اور اس شاعرانہ تخیل میں فکر و فن کے جلوے دکھائے ہیں۔ انھوں نے دنیاوی تکالیف سے راحت کا سامان اس عالم روحانی میں محسوس کیا جس کو خود ان کے حُسنِ تصور نے جنم دیا تھا، اور جو خود اُن کا اپنا وضع کردہ تھا۔

ان مہاجرین نے شروع میں فقر و فاقہ اور تنگی و ترشی برداشت کی تھی لہذا ان کی طبیعت پر دو طرز کے اثرات مرتب ہوئے، ایک تو یہ کہ انھوں نے مالداروں سے نفرت اختیار کی اور ان کو حقارت کی نظر سے دیکھا۔ چنانچہ زکی ابو شادی کہتے ہیں:۔

کلوا واشربوا ایہا الاغنیاء   وان ملأ اسماعک الجائعون

اے مالدارو! کھاؤ اور پیو چاہے راستے بھوکوں سے بھرے ہوں۔

فلا تلبسوا الخز الا جدیدا   وان لبس الخلق البائسون

---

[1] دور قدیم میں کچھ عرب رات کو آگ روشن کرتے تھے تاکہ مسافر مہمان اس کو دیکھ کر آجائیں۔

(ہمیشہ) نئے ریشمی کپڑے پہنو خواہ غرباء پھٹے کپڑوں میں ملبوس ہوں۔

وحوطوا قصورکم بالرجال   وحوطوا رجالکم بالحصون

اپنے محلوں کو لوگوں سے گھیر لو اور اپنے (خادم) لوگوں کو قلعوں میں رکھو۔

فلا تبصرون ضحایا الطوی   فلا تبصرون الذی تصنعون

تم بھوک کے ماروں کو نہیں دیکھتے تم جو کچھ کرتے ہو اس پر تمھاری نگاہ نہیں ہے۔

ابتدائی زندگی میں فقر و فاقہ کا اثر تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ یہ شعراء بخیل ہو جاتے مگر انکی بلند نظری نے مال کو ان کی نگاہوں میں حقیر بنا دیا۔ انہوں نے سخاوت کی تعلیم دی اور مال کو اہل حاجت میں تقسیم کر دینے کا مشورہ دیا تاکہ ان کی ضرورت بھی پوری ہو سکے، رشید ایوب کہتا ہے:۔

سمح ہو المرأ المفرق مالہ   ولکن من یعطی من القلب اسمح

جو اپنا مال بانٹتا ہے وہ فیاض ہے مگر جو دل کی خوشی سے دیتا ہے وہ زیادہ بڑا سخی ہے۔

ندرہ حداد نے کہا کہ مال اگر جمع کرو تب بھی غریبوں کا حق نہ بھولو۔

اجمع المال اذا استطعت   ولا تنس العطاء

مال جمع کر مگر جہاں تک ہو سکے داد و دہش نہ بھول،

میخائیل نعیمہ جنگل کی زندگی کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے:۔

ہوذا قد اقبل اترابی   اھلاً اھلاً باصحابی

الناس تسیر الی القداس   ونحن نکر الی الغاب

وہ ہمارے ساتھی آرہے ہیں، مرحبا دوستوں کو جو مقدس جگہ جا رہے ہیں، ہم جنگل کی طرف رواں ہیں۔

جبران اسی فطری سادگی کی طرف بلاتا ہے، اس نے اپنے قصیدہ " المواکب " میں اسی فطری زندگی کی طرف دعوت دی ہے۔

ان شعراء نے حیات و مظاہر کائنات کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے جنگل، رات، سمندر، موسم بہار اور موسم خزاں وغیرہ کی مکمل ترجمانی کی ہے۔ خصوصاً خزاں کے بارے میں قدیم شعراء زیادہ توجہ نہ کرتے تھے، اگرچہ بہار کی تعریف سے ان کے دواوین بھرے ہیں۔ انہوں نے ہر موقع پہ اپنے وطن لبنان کو بھی یاد کیا ہے۔ اگر بہار ہے تو لبنان کی بہار ان کے دل کو وطن کی طرف لے جاتی ہے اور اگر خزاں ہے تو وہی وطن کی خزاں نگاہوں میں مصور ہے۔

ان شعراء نے مساوات اور اخوت کی تعلیم بھی دی ہے۔ اگرچہ یہ لوگ امریکہ میں مقیم تھے جہاں نگروا اور کالے افریقیوں کے ساتھ غیر مساوی برتاؤ روا رکھا جاتا تھا مگر خود ان کے وطن لبنان میں عثمانی خلافت نے ان کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کیا تھا۔ یہاں یہ حقیقت واضح کر دینی ضروری ہے کہ عثمانی خلافت کی مخالفت میں یورپی استعمار نے جو پروپیگنڈہ کیا ہے اس کے اثرات سے عربی ادب و تاریخ کی کتابیں پُر ہیں مگر حکومت عثمانیہ نے جس طرح روسی، امریکی، فرانسیسی اور انگریزی حکومت کو اپنے مدارس، کالج اور ادارے کھولنے اور لبنان کے عیسائیوں کی تعلیم و تربیت اور مشنریوں کو کام کرنے کی آزادی دے رکھی تھی اس کا ذکر کہیں نہیں ملتا ورنہ یہ لبنانی عیسائی ادیب و شاعر بننے کے لائق ہی نہ ہوتے۔

یہ شعراء فطرت پرست تھے۔ انہوں نے شہروں میں بجلی کے قمقموں، رنگینیوں اور ملمع سازیوں سے نفرت کا اظہار کر کے جنگلوں، دیہاتوں، سبزہ زاروں اور باغوں کی زندگی کو ترجیح دی، اس لئے کہ وہاں فطرت بے نقاب تھی، وہاں اصل زندگی کا مظاہرہ تھا۔ یہ تکلف سے پُر شہری زندگی قدرت کی اصلی دولت "سادگی" سے محروم ہے

(باقی)

کلام اللہ ازلی۔ ذکر من الرحمن محدث
تراجم قرآن مجید۔ تازہ بتازہ نو بنو

از ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پیرس

تمہید تیس ۳۰ برس ہوتے ہیں، موقر رسالہ معارف کے دسمبر ۱۹۵۹ء کے شمارے میں میرے ایک مضمون کو اشاعت کی عزت بخشی گئی تھی، "قرآن مجید کے فرانسیسی ترجمے"۔ اس میں اس وقت تک کے سارے معلوم فرانسیسی ترجموں کا تاریخ وار ذکر کیا گیا تھا، اور ان چھبیس ۲۶ تراجم کی فہرست میں سب سے آخری وہ تھا جسے اس سے ایک ہی مہینہ پہلے یکم نومبر ۱۹۵۹ء کو شائع کرنے کی مجھے سعادت حاصل ہوئی تھی، اُس مضمون میں خاص کر اس آخری ترجمے کی سرگزشت بھی درج تھی کہ کن حالات میں وہ کام ہاتھ میں لیا گیا اور کس طرح جلد اجلدی میں تکمیل کو پہنچایا گیا۔

ان تین دہ سالگیوں میں بہت سے نئے ترجمے بھی شائع ہوئے ہیں، اور اپنی بعض پرانی معلومات کی اصلاح بھی کرنی پڑی ہے، جس سے ناظرین معارف کو ناواقف نہیں رہنا چاہیے، اجازت ہو تو آج اسی موضوع پر عود بھی کروں اور نظر ثانی بھی، اور اس کی ایک ضمنی، ذیلی تقریب یہ بھی ہوئی ہے کہ خود میرے ترجمہ کا، خدا کی ششدر کرنے والی عنایت سے، پندرہواں اڈیشن اس وقت مطبع میں ہے، پروف دیکھ چکا ہوں، سابق میں کچھ نہیں تو دو ڈھائی لاکھ نسخوں کی نکاسی ہو چکی ہے، اور مانگ کی کثرت سے اس دفعہ نیا اڈیشن ناشر ایک لاکھ کی تعداد میں چھاپ رہا ہے، وللہ الحمد والمنۃ۔

اس تمہید کی تتمیم کرتے ہوئے عرض کروں گا کہ مقالہ ہٰذا کی تدوین کے لیے جب معارف موقر کا متعلقہ پرانا شمارہ نکالا تو کچھ عجیب باتوں سے بھی دوچار ہوا: اس میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب بھی مقالہ نگاروں میں تھے، اور ان کا نام اب رسالے کے ٹائٹل کو زیب دے رہا ہے، اسی ٹائٹل کے آخری صفحہ پر "خطبات مدراس" اور "رحمت عالم" جیسی شہرۂ آفاق کتابوں کا اشتہار بھی تھا، ابھی ابھی اطلاع آئی ہے کہ میری "خطبات بہاولپور" کا نظر ثالث شدہ اڈیشن اسلام آباد میں چھپ گیا ہے جو "خطبات مدراس" ہی کا خوشہ چین اور گویا تکملہ ہے، اسی طرح میری فرانسیسی سیرۃ النبیؐ کے پانچویں اڈیشن کے پروف بھی آئے ہوئے ہیں اور ان شاء اللہ چند ماہ میں چھپ جائیں گے۔

اسی شمارۂ معارف میں جگن ناتھ آزاد کی منظوم تاریخ انسانیت سے ختم المرسلینؐ کی ولادت باسعادت کا متعلقہ اقتباس بھی پڑھا، بے اختیار آنسو بہ نکلے، معلوم نہیں موصوف ابھی بقیدِ حیات ہیں یا نہیں[1]۔ جی چاہتا ہے کہ اس نظم کا فرانسیسی ترجمہ کر کے یہاں کے کسی رسالہ میں شائع کروں، واللہ المستعان، یہ ہو سکا تو ان شاء اللہ اطلاع دوں گا۔

آمدم برسر مطلب:

تصحیح | دسمبر ۱۹۵۹ء کے معارف کے محولہ پرانے مضمون میں، پرانی معلومات کی اساس پر (جو "جیوئش انسائیکلوپیڈیا" پر مبنی تھیں) عرض کیا تھا کہ اولین معلوم فرانسیسی ترجمۂ قرآن مجید طلیطلہ (اندلس) کے عالم دون ابراہام DON ABRAHAM (غالباً یہودی) کا ہے، قشطیلہ کے حکمران الفونسو دہم (حکمرانی ۶۵۰ھ / ۱۲۵۲ء تا ۶۰۳ھ / ۱۲۸۴ء) کے حکم سے یہ کام اسپینی زبان میں کیا گیا، اور پھر اسی اسپینی سے بون آوین تورا دے سیوے (BONNAVENTURA DE SEVE)

---

[1] بقید حیات ہیں اور علمی سرگرمیوں میں مشغول بھی۔ (معارف)

نے اس کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔

مگر روما کے آنجہانی فاضل پروفیسر لیوی دیلا ویدا (LEVI DELLA VIDA) نے اپنے ایک عنایت نامے میں مجھے لکھا تھا کہ یہودی انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار اشٹائن شنائیڈر (STEINSCHNIDER) کو غلط فہمی ہوئی ہے، دون ابراہام نے سورۂ معارج کا نہیں، بلکہ ایک عربی معراج نامے کا اسپینی میں ترجمہ کیا تھا، یہ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ اس کا لاطینی اور فرانسیسی میں BONAVENTURA DE SIENNE نے ترجمہ کیا، اور یہ کہ اس کا نام DE SEVE غلط ہے، یہ ایک شہر ہے جو اٹلی میں ہے، اور اطالوی میں SIENA لکھا جاتا ہے (یعنی سیئنا والا) اس موضوع پر دیکھو چیرولی کی اطالوی کتاب معراج

E. CERULLI; IL LIBRO DELLA SCALLA.

میری تازہ معلومات کے مطابق قدیم ترین فرانسیسی ترجمۂ قرآن دون ابراہام کا نہیں، بلکہ میشائیل بوڈئے (MICHAEL BAUDIER) کا ہے (جس کا زمانہ ۱۵۸۰ء تا ۱۶۴۵ء کا ہے) یہ مستقل ترجمۂ قرآن تو نہیں ہے، بلکہ اس کی کتاب "ترکوں کے مذہب کی تاریخ" (HISTOIRE DE LA RELIGION DES TURCS) مطبوعہ پاریس ۱۶۲۵ء میں بکثرت آیات قرآن کا کامل مفہوم یا تلخیص و خلاصہ دیا گیا ہے، اچھا ہو یا بُرا، یہ سب سے پُرانا ترجمہ ہے جو فرانسیسیوں کو ان کی اپنی زبان میں پڑھنے کو ملا تھا۔

معارف کے محولہ پرانے مضمون میں فرانسیسی تراجم کی مجموعی تعداد چھبیس ۲۶ دی گئی تھی، میرے زیر طبع فرانسیسی ترجمۂ قرآن کے دیباچے میں فرنگی زبانوں کے تراجم قرآن کی جو فہرست ہے اس میں فرانسیسی میں اب پورے سَتّر ترجمے بلکہ کچھ زائد ہی دیے گئے ہیں، آج اس پوری تفصیل سے بحث نہیں کروں گا، صرف اپنے ترجمے کی سرگزشت عرض کروں گا:

اس کے پہلے اڈیشن کی ۲۰ اکتوبر ۱۹۵۹ء کو طباعت مکمل ہوئی تھی، اس میں سے چھبیس[۲۶] نسخے خصوصی عمدہ کاغذ پر چھپے، اور ان پر حروف (A) تا (Z) بھی درج کیے گئے ہیں (یہ ناشر نے خاص لوگوں کو دیے) مزید ایک سو نسخے بھی اچھے کاغذ پر چھپے، اور ان پر اعداد (I، II تا C) درج ہیں، اور یہ ناشر کمپنی کے مالکوں اور حصہ داروں کے لیے مخصوص کیے گئے، ان کے علاوہ بارہ[۱۲] ہزار نسخے چھپے جن پر ہندسے (1، 2 تا 12000) درج ہیں، اور یہ ناشر کمپنی کے شرکا کے لیے فروخت کے لیے پیش کیے گئے، [ناشر کا نام ہے "کتابوں کا فرانسیسی کلب" CLUB FRANÇAIS DU LIVRE. اور اس کی نشریات صرف ان لوگوں کو فروخت کی جاتی ہیں جو اس کلب کے ممبر ہیں، عام خریداروں کو نہیں]۔ ترجمہ چھپتے ہی ممبر ٹوٹ پڑے، اور یہ ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور ناشر ان کو ہر کتاب کی اشاعت کی اطلاع اور تفصیل دیتا ہے، چنانچہ اس ترجمہ کی خوبصورت طباعت اور خوبصورت زریں جلد کے باعث سارے بارہ[۱۲] ہزار نسخے صرف دو[۲] ہفتوں میں بک گئے، خفیف اصلاح کے بعد دوسرا اڈیشن نومبر ۱۹۵۹ء میں کلب ہی نے چھاپا، اس کا ایک چوری کا عکسی اڈیشن قم میں بلا تاریخ چھپا، تیسرا اور چوتھا اڈیشن ناشر کی اجازت سے پاریس کے مطبع قرطاجہ کے مسلمان مالک نے ۱۹۶۳ء میں چھاپے۔ ان میں سے ایک میں عربی متن بھی ہے، پاریس کے ایک غیر مسلم ناشر کتب پادو (PADOUN) نے ۱۹۶۵ء میں ایک نیا پانچواں اڈیشن بہ اجازت چھاپا، اس میں جو عربی متن ہے وہ ترکی کے ایک مشہور خطاط کا لکھا ہوا ہے، اور ترکی کے محکمۂ امور مذہبی نے اس کا عکس چھاپا تھا مگر اس فرانسیسی ناشر نے ترکی حکومت سے اجازت لینی ضروری نہ سمجھی، اس اڈیشن کی دو[۲] جلدیں ہیں، ایک میں قرآن کا متن و ترجمہ اور دوسری میں کچھ لونو تصویریں ہیں، اور گویا ترجمے کی ہمراہی جلد ہے، یہ مؤلف سے پوچھے بغیر ناشر نے کیا تھا، چھٹا اور ساتواں اڈیشن مؤلف کی نظرثانیوں کے بعد

اصل ناشر ہی نے ۱۹۶۶ء اور ۱۹۷۱ء میں چھاپے، آٹھواں نظرثانی شدہ اڈیشن عربی متن کے ساتھ ۱۹۷۳ء میں بیروت میں چھپا، اس کے ناشر نے اس کے دو[۲] مزید اڈیشن بلا ترمیم چھاپے، مگر ان پر تاریخیں درج نہ کیں، نواں چوری کا اڈیشن جو تیسرے اڈیشن کا عکس ہے کتب خانہ اشاعت اسلام، دہلی نے عربی متن کے ساتھ چھاپا، اور اس کے دو[۲] مزید اڈیشن بلا تاریخ طبع ہوئے، اور یہ جزیرہ موریشس کے ایک مسلمان تاجر کے مصارف پہ نکلے، دسواں اڈیشن مؤلف کی نظرثانی سے عربی متن کے ساتھ بیروت میں دو[۲] جلدوں میں چھپا، اسی کو ۱۹۸۰ء میں حکومت قطر نے مکرر چھپوایا، گیارہواں اڈیشن بلا ترمیم بیروت میں ۱۹۸۱ء میں ایک جلد میں طبع ہوا، بارہواں اڈیشن بعد نظرثانی ۱۹۸۳ء میں انقرہ میں چھپا ہے، ایک چوری کا اڈیشن جس میں باہر دسواں اڈیشن لکھا ہے اور اندر گیارہواں اڈیشن لکھا گیا ہے، بیروت میں چھپا ہے، مگر یہ حقیقت میں بیروت کے آٹھویں اڈیشن کا عکسی چھاپا ہے، تیرہواں اڈیشن مؤلف کی نظرثانی کے بعد ۱۹۸۵ء میں پچاس[۵۰] ہزار کی تعداد میں امریکا میں چھپا، چودہواں اڈیشن مؤلف کے علم و اجازت کے بغیر ۱۹۸۵ء ہی میں بیلجیئم LE HENNIH نامی کمپنی نے شائع کیا جو غالباً ایک پرانے اڈیشن کا عکسی چھاپا تھا، اور جس میں عربی متن بھی لگایا جانا معلوم ہوا، یہ کمپنی افلاس کے باعث جلد ہی ٹوٹ گئی، اور مؤلف کو اس اڈیشن کی صورت دیکھنے کا بھی موقع نہ مل سکا، اللہ کی مرضی!، پندرہواں اڈیشن مؤلف کی نظر جدید کے بعد آج کل (یہ مضمون لکھتے وقت، اکتوبر ۱۹۸۸ء میں) امریکا میں زیر طبع ہے، اور اس کے مسلمان ناشر کا بیان تھا کہ مانگ کی کثرت کے باعث اس کے ایک لاکھ نسخے چھاپے جا رہے ہیں! وللہ الحمد،

اپنے اس ترجمے کی خصوصیتیں پرانے مضمون میں لکھ چکا ہوں، نئے ناظرین سے معذرت کرتا ہوں کہ اس کی تکرار نہیں کر سکتا، اس میں سو[۱۰۰] صفحے سے زائد کا ایک مقدمہ ہے جس میں خاص کر

قرآن مجید کی تدوین کی تاریخ اہمیت رکھتی ہے ۔ نئے زیر طبع اڈیشن میں اس سند کا فوٹو بھی شامل کر رہا ہوں جو مسجد نبوی کے شیخ القراء نے اس گناہگار کو شروع سے آخر تک پورا قرآن مجید ان کو سنانے کے بعد عطا فرمائی تھی، اس میں نسلاً بعد نسلٍ سارے اساتذہ کا ذکر ہے، اور آخری مرحلے میں حضرت عثمان، حضرت علی، حضرت ابن مسعود، حضرت اُبیّ بن کعب اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم پانچ صحابیوں سے سننے کا ذکر ہے، اور اس سے اوپر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آتے ہیں، اس مقدمہ کے بعد فرنگی زبانوں کے سارے تراجم کا ذکر ہے، یہ اُنچاس[۴۹] زبانیں ہیں، اور بعض میں کامل نہیں صرف جزئی ترجمہ ہوا ہے، ضخامت کے خیال سے مشرقی زبانوں کا اس فہرست میں ذکر نہیں ہے، کتاب میں تین انڈیکس ہیں، ایک مقدمہ کا، دوسرا مترجمین کی فہرست کا، اور تیسرا ترجمہ وحواشی قرآن کا، خطا ونسیان سے مبرا نہیں ہوں، عفو مولا کا فقیر ومحتاج ہوں۔

ترجموں کی فہرست | دنیا میں جتنی بھی عجمی (غیر عربی) زبانیں ہیں ان میں سے ہر ایک میں قرآن مجید کے ترجمے کی ضرورت ہوگی، تاکہ جن کو عربی نہیں آتی وہ بھی احکام خداوندی سے واقف ہو سکیں، اسے وہی شخص کر سکتا ہے جسے دونوں زبانیں آتی ہوں، اور اچھی آتی ہوں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک ہی زبان میں کئی کئی لوگ ترجمہ کرتے ہیں، قرآن مجید کے ترجمہ کا آغاز عہد نبوی سے ملتا ہے، مشہور حنفی فقیہ شمس الائمہ سرخسی اور امام تاج الشریعہ بیان کرتے ہیں کہ چند نومسلم ایرانیوں نے حضرت سلمان فارسی رض سے خواہش کی کہ وہ ان کو نماز کے لیے لابُد عنصر یعنی سورۂ فاتحہ کا فارسی ترجمہ مہیا کریں، حضرت سلمان فارسی رض نے اس کو انجام دینے کے بعد رسول اکرم ص سے عرض کیا، اور آپ نے منع نہ فرمایا تو وہ ترجمہ ان کو بھیج دیا، اور یہ لوگ اس کو اس وقت تک نمازوں میں پڑھتے رہے جب تک کہ عربی متن ان کو یاد نہ ہو گیا، اور یہ کہ اس فارسی ترجمے کا پہلا جملہ تھا:

"بنام خداوند بخشایندۂ مہربان"۔

جیسے جیسے اسلام پھیلتا گیا، عام تعلیم کے لیے کامل قرآن مجید کے ترجموں کی ضرورت ہونے لگی، دوست ہی نہیں دشمنوں کو بھی، تاکہ اسلام کی تردید کر سکیں، نومسلموں میں فارسی اور ترکی سرفہرست نظر آتے ہیں تو معترضین میں سُریانی اور یونانی۔

مجھے معلوم نہیں ساری زبانوں کے معلوم تراجم قرآنی کی فہرست سب سے پہلے کس نے مدوّن کی، البتہ یہ جانتا ہوں کہ دیگر اسلامی چیزوں کے ساتھ فرنگیوں نے، خاص کر گزشتہ صدی میں اس سے بھی دلچسپی لی، مثلاً وکتور شووین (VICTOR CHAUVIN) کی فرانسیسی کتاب (مطبوعہ بلجیم) ہے جس کے عنوان کا ترجمہ ہوگا: "ان کتابوں کی فہرست جو عربی ہیں، یا عربوں سے متعلق ۱۸۱۰ء سے ۱۸۸۵ء تک عیسائی یورپ میں چھپیں" (مخفف نام: بلیوگرافی (BIBLIOGRAPHIE)) کی دسویں جلد قرآن اور حدیث سے متعلق ہے، اس میں تراجم قرآن مجید کا کافی مواد ہے، یورپ اور امریکا کے بڑے کتب خانوں کی فہرستوں سے مدد ملتی ہے، امریکا کے مشنری رسالے "مسلم ورلڈ" نے اس بارے میں ایک خصوصی اور طویل مقالہ شائع کیا، غالباً اسی سے لے کر مصر کے عربی رسالے الہلال میں جرجی زیدان نے بھی ایک مقالہ چھاپا، مگر یہ سب سوکھی پھیکی فہرستیں تھیں جن میں زبان وار مترجموں کے نام اور زیادہ سے زیادہ ترجمے کی تاریخ طباعت درج تھی، مگر میں شروع میں ان سے بھی واقف نہ تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ خود توریت وانجیل کے تراجم کی بھی مکمل فہرستیں میرے علم میں نہیں پائی جاتی ہیں۔

مجھے اس سے دلچسپی ایک انگریزی کتاب دیکھ کر ہوئی، اس کا نام ہے "انجیل بہت سی زبانوں میں" (GOSPEL IN MANY TONGUES)۔ اس میں کئی سو نمونوں کا نام

اور ہر ایک میں انجیل کا ایک مختصر اقتباس بطور نمونہ دیا گیا ہے، اس میں عربی بھی ہے، اردو بھی، اور ایسی زبانیں بھی جن کا نام بھی مجھے پہلی دفعہ اس کتاب سے معلوم ہوا، یہ کوئی پانچ سات سو زبانوں کے مواد پر مشتمل کتاب تھی جس سے مجھے تاسف ہوا کہ ہم نے قرآن کی کیا خدمت کی ہے؟ اس میں صرف تراجم کے اقتباس ہیں، مترجموں سے بحث نہیں ہے،

آمدم برسر مطلب، حیدرآباد دکن میں مرحوم ابو محمد مصلح صاحب نے (جو غالباً بہار کے باشندے تھے، اور "بچوں کی تفسیر" کے مؤلف، لاہور وغیرہ میں عرصہ تک قرآن مجید کی خدمت میں سرگرم رہ چکے تھے)، "عالمگیر تحریک قرآن مجید" کے نام کی ایک انجمن ۱۳۴۷ھ/۱۹۲۸ء میں قائم کی، اس کا مقصد دنیا کی ساری زبانوں میں قرآن مجید کے ترجمے شائع کرنا تھا، رفتہ رفتہ مجھے بھی اس سے واقفیت ہوئی، اور موسس کا ہاتھ بٹانے کی تھوڑی بہت مجھے بھی سعادت حاصل ہوئی، چنانچہ ۱۳۶۴ھ/۱۹۴۵ء میں "القرآن فی کل لسان" (QUR'AN IN EVERY LANGUAGE) نامی کتاب اسی انجمن نے شائع کی، اس میں ۲۳ زبانوں کے بارے میں مواد تھا، ہر زبان کے سارے معلوم ترجموں اور ترجموں کی فہرست، اور بطور نمونہ سورۂ فاتحہ کا ترجمہ ہر زبان کے ساتھ شامل کیا گیا، کتاب بہت مقبول ہوئی، والحمد للہ، اور دوسرے ہی سال ۱۳۶۵ھ/۱۹۴۶ء میں اس کا دوسرا اڈیشن نکلا، اور اس دفعہ ۴۳ زبانوں کا ذکر کیا جا سکا، پھر ہنگامی کثرت سے ۱۳۶۶ھ/۱۹۴۷ء میں تیسرا اڈیشن بھی نکلا، جس میں ۶۷ زبانوں کے ترجموں کا پتہ چلا تھا۔

پھر مشیت الٰہی یہ ہوئی کہ انگریز بھی ملک بدر ہوں، اور سلطنت آصفیہ بھی بڑے خون خرابے کے ساتھ ختم ہو۔

اس کے بعد سے مجھے اس کا موقع تو نہ ملا کہ کتاب کا نیا اڈیشن نکال سکوں، لیکن معلومات

جمع کرنے کا شوق برقرار رہا، اس کا بھی موقع ملا کہ عالم دوستوں اور ملاقاتیوں کی مدد سے سورۂ فاتحہ کے نئی نئی زبانوں میں ترجمہ کرا کر اپنے ذخیرے کا حجم مصنوعی طور پہ بڑھا سکوں، آج کل میرے پاس ڈیڑھ سو سے زیادہ زبانوں کا مواد فراہم ہو گیا ہے، جن میں سے تقریباً اسّی میں کامل ترجمۂ قرآن ہے، باقی میں جزئی۔

یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ تراجم قرآن کی کثرت کے لحاظ سے مشرقی زبانوں میں اردو کا نمبر سب سے پہلے آتا ہے، کہ اس میں پانچ سات سو ترجمے بتائے جاتے ہیں، پھر ترکی اور فارسی کا نمبر آتا ہے، فرنگی زبانوں میں انگریزی، فرانسیسی اور جرمن فائق ہیں۔

جوئندہ یابندہ، کتاب کی اشاعت کے وسائل نہ ہونے پر یہ سوچا کہ کتاب کی جگہ مقالے چھاپوں، اتفاق کی بات ہے کہ سنہ ۱۹۶۰ء میں ایک ایرانی صاحب سے ملاقات ہوئی جو پاریس سے فرانسیسی زبان میں "افکار شیعہ" (LA PENSE CHI'ITES) نامی ایک دوماہی رسالہ نکالنے لگے۔ مجھے کچھ حرج نہ معلوم ہوا کہ اس کے ہر نمبر میں حروف تہجی پر ایک ایک زبان کا مواد شائع کروں اور ساتھ ہی حسب سابق سورۂ فاتحہ کا ترجمہ بھی اس زبان میں دیتا جاؤں، لیکن دو ہی سال بعد، بارہ ہی نمبر نکلے تھے کہ سنہ ۱۹۶۲ء میں یہ رسالہ بند ہو گیا، اس میں فرانسیسی افریقائی، البانی، انخیادو، المانی (جرمن)، عربی، ارمنی، آسامی اور آذری کا ذکر آیا تھا، پھر ایک تونسی مسلمان پاریس ہی سے "فرانس اسلام" نامی ایک ماہوار رسالہ سنہ ۱۹۶۷ء سے فرانسیسی زبان میں شائع کرنے لگے، میں نے اس سے بھی استفادہ کیا، پچاس ایک نمبر نکلنے کے بعد مالی دشواریوں سے یہ رسالہ بھی بند ہو گیا، رسالہ افکار شیعہ کچھ عرصہ بند رہنے کے بعد سنہ ۱۹۸۰ء میں دوبارہ "بینش اسلام" (CONNAISSANCE DE L'ISLAM) کے نام سے شائع ہونا شروع ہوا، پھر سنہ ۱۹۸۲ء میں مکرر بند ہو گیا، مرضی مولا از ہمہ اولیٰ!

اس سلسلہ کی ایک آخری چیز یہ ہے کہ بعض عربی سلطنتوں اور ترکی حکومت نے استانبول میں ایک ادارہ قائم کیا ہے، جو اسلامی تاریخ، فنون لطیفہ اور ثقافت (تہذیب و تمدن) پر تحقیقاتی کام کرتا ہے، وہاں کے مواد کی کثرت کے باعث استانبول سے بہتر اس کا کوئی مرکز نہیں ہو سکتا، اس کے ناظم اعلیٰ (ڈائرکٹر جنرل) ایک ترکی فاضل ڈاکٹر اکمل الدین احسان اوغلو ہیں، انہوں نے ۱۴۰۶ھ/۱۹۸۶ء میں ایک کتاب انگریزی میں چھاپی ہے، جس کا نام ہے: (WORLD BIBLIOGRAPHY OF TRANSLATIONS OF THE MEANINGS OF THE HOLY QUR'AN, PRINTED TRANSLATIONS 1515-1980- یعنی مطبوعہ تراجم قرآن مجید کی عالمگیر فہرست از ۱۵۱۵ء تا ۱۹۸۰ء اس میں ۸۸۰ + ۳۴ صفحے ہیں، قلمی تاحال شائع نشدہ ترجمے اس فہرست سے خارج ہیں، لعل اللہ یحدث بعد ذلک أمرا۔

یہ بیان کرنا شاید ضروری ہے کہ یک لسانی فہرستیں بھی ہیں، صرف فارسی ترجموں پر، صرف ترکی ترجموں پر (از ناچیز حمید اللہ)، وغیرہ، نیز یہ بھی کہ جب ۱۹۵۹ء میں میرا فرانسیسی ترجمۂ قرآن مجید شائع ہوا، تو اس کے فرنگی ناشر کے اصرار پر میں نے اس کے مقدمے میں صرف یوروپی زبانوں کے ترجموں کی مکمل فہرست شامل کی (مؤلف کا نام، مقام اشاعت، تاریخ طباعت ہائے مختلفہ وغیرہ) اس میں بشمول ترکی و البانی اٹھائیس (۲۸) زبانوں کا مواد تھا، اس کے پندرہویں اڈیشن میں جو ان سطروں کی تحریر کے وقت (۱۴۰۹ھ/۱۹۸۸ء) مطبع میں ہے چھیالیس (۴۶) زبانوں کا ذکر ہے، ان میں سے متعدد کئی کئی خطوں میں لکھی جاتی ہیں، مثلاً یوگوسلاوی (بوشناقی) زبان عربی، لاطینی اور روسی تین خطوں میں ملتی ہے، ترکی زبان اویغوری، عربی، لاطینی اور روسی چار خطوں میں، یونانی زبان عربی اور یونانی خطوں میں، پولینڈی زبان عربی اور لاطینی خطوں میں،

وغیرہ؛ ایک زمانے میں اندلسی زبان صرف عربی خط میں لکھی جاتی تھی، مسلمانوں میں بھی، عیسائیوں میں بھی، اور اسے نام دیا جاتا تھا "الخمیادو" (ALJAMIADO) (حرف "ج" (جے) کا تلفظ "خ" اور یہ نام ہے "الأعجمية" کا ہسپینی تلفظ۔ اور اس زبان میں متعدد تراجم قرآن مجید تاحال کتب خانوں میں محفوظ ہیں، اور میرے پاس ان کے مائکروفلم، وسائل کا انتظار ہے کہ ان کو چھاپ دوں۔

ایک نئی کتاب کا تعارف ۱۹۸۶ء میں اسلام آباد میں ایک نئی کتاب ہمارے موضوع پر چھپنے لگی، اور ابھی ابھی شائع ہوئی ہے، یعنی "قرآن کریم کے اردو تراجم، کتابیات، مرتبہ ڈاکٹر احمد خان"، ناشر: "مقتدرۂ قومی زبان، اسلام آباد"۔

اس کے مؤلف، جو فاضل بھی ہیں، سابق میں عرصے تک پاکستان کے ادارۂ تحقیقات علمیہ کے کتب خانے کے ناظم بھی رہے ہیں، اور میرے بہت عزیز دوست بھی ہیں اسی لیے ان سے گلے اور شکوے سے آغاز کرتا ہوں۔

کتاب کے مقدمے میں (ص ۱۶ پر) وہ مجھ ناچیز کی کتاب "القرآن فی کل لسان" کا ذکر واقفانہ انداز سے کرتے ہیں، لیکن جب صفحہ ۲۹۱ و مابعد میں مآخذ و مراجع کا ذکر کرتے ہیں تو یہ کتاب نظر نہیں آتی، ذکر آتا ہے تو صفحہ ۲۹۵ پر مغربی زبانوں کی کتابوں میں میرے فرانسیسی ترجمۂ قرآن مجید طبع دہم کے مقدمے میں مندرج فہرست تراجم کا، حالانکہ اس فہرست میں اردو تراجم کا کوئی ذکر نہیں ہے، معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی تالیف کے وقت "القرآن فی کل لسان" ان کے سامنے نہ تھی، اور انھیں تکلف ہوا کہ مجھے لکھ کر اس کے دیکھنے کا موقع حاصل کر سکیں، اس میں اردو تراجم کی طویل فہرست ہے، اور میں نے دیکھا کہ اس میں ایسے ترجمے بھی مذکور ہوئے ہیں جن کا مواد انھیں زیر تبصرہ تالیف کے لیے کسی اور ماخذ سے نہ مل سکا، اس پر میں نے اپنی پرانی کتاب کی

فوٹو کاپیاں لے کر فوراً انھیں ہوائی ڈاک سے بھیج دیں، تاکہ کسی آیندہ اڈیشن میں ان سے استفادہ کرسکیں، ہمارے مؤلف امیرکا کی نیشنل یونین کیٹیلاگ (NATIONAL UNION CATALOG) سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں جو کئی سو جلدوں میں ہے اور بہت اہم اردو ماخذوں میں خود پاکستان میں چھپی ہوئی کتاب "تذکرۃ المفسرین" مولفۂ قاضی زاہد الحسینی بھی مفقود ملی۔

بہرحال زیر نظر کتاب ان تالیفوں میں تازہ ترین ہے جو ایک ہی زبان کے تراجم قرآن سے بحث کرتی ہیں، جیسا کہ عرض ہوا، اردو اس بارے میں سب سے باثروت ہے، اور خوش قسمتی سے اس کتاب کو ایسے فرد نے مرتب کیا ہے جو اس فن کا ماہر اور تجربہ کار ہے، یقین ہے کہ جلد ہی اس کی طباعتِ جدیدہ کا موقع ملے گا، اور اس وقت اس میں مزید اصلاحیں بھی عمل میں آئیں گی۔

کتاب تاریخ وار نہیں بلکہ مولف وار ہے، اور مولفوں کے نام حروف تہجی پر مرتب ہیں، میں شخصی طور پر اس کو پسند کروں گا کہ تراجم کو تاریخ تالیف پر مرتب کیا جائے، یعنی سب سے قدیم معلوم مترجم کا ذکر سب سے پہلے آئے، اور اسی اندراج میں اس کی جملہ طباعتوں کا ذکر کر دیا جائے، اور کتاب میں ایک اشاریہ ہو جو مترجموں کے ناموں کا حروف تہجی پر ذکر کرے، اس میں فائدہ یہ ہے کہ بعض ناموں کا اشاریے میں کئی بار ذکر کیا جا سکتا ہے، مثلاً اس دفعہ پہلا نام آغا قزلباش دہلوی کا ہے، میرے مجوزہ اشاریے میں وہ آغا اور قزلباش دو جگہ آسکتا ہے، اس دفعہ امام غزالی کا ذکر حرف الف میں ہے، میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں ان کی تلاش کبھی حرف الف میں نہ کرسکتا، امام فخرالدین رازی کا ذکر حرف الف میں نہیں، حرف ر میں ہے۔

اس دفعہ مکمل اور جزوی (جزئی؟) اردو تراجم کی مجموعی فہرست نمبر ۱۰۱۱ پر ختم کی گئی ہے، لیکن نظر آیا کہ ایک ہی ترجمہ کئی بار کئی مقاموں پر چھپا ہو تو نمبر برقرار رکھنے کی جگہ نیا نمبر دیا گیا ہے، اس سے یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ حقیقت میں اردو میں کتنے ترجمے ہوئے، شاید مشکل سے اس کے ایک تہائی ہوں،

جاتوں میں سے ایک یہ ہے کہ ایک اشاریہ مطبعوں کے ناموں کا دیا گیا ہے، دوسری یہ کہ ایک اشاریہ ان لوگوں کا ہے جنھوں نے اردو ترجمہ راست اصل عربی سے نہیں کیا، بلکہ کسی اور زبان کے ترجمے کو "اردو میں ڈھالا"۔ اچھا ہوتا اگر وہیں توسین میں مزید وضاحت ہوتی کہ اس سے کیا مراد ہے، اشاریے میں مندرج "ف" سے مراد غالباً فارسی ہے، لیکن "ع" سے کیا عربی مراد ہے؟ سارے ہی ترجمے عربی سے ہوئے ہیں، نمبر (۱۴۶) پر حضرت امام حسنؓ کے ترجمے کا ذکر ہے، اور تفصیل میں اسے حضرت امام حسینؓ کی تفسیر کا ترجمہ بتایا ہے، صحیح کون ہے؟

معمولی طباعتی غلطیاں بھی ناگزیر تھیں، مثلاً مترجم نمبر ۲۲۹ کو ۶۲۹ لکھا گیا ہے۔

مگر ان معمولی چیزوں سے قطع نظر کتاب خوش آمدید کہے جانے کے لائق ہے، اور اپنے موضوع پر فی الوقت حرف اخیر ہے، خدا کرے جلدی ان کی مکمل تر اشاعت کا موقع ملے، موضوع ہی ایسا ہے کہ ہر روز نئے تراجم قرآن کی اشاعت سے ترمیم و تکمیل کی ضرورت رہے گی، شاذ و نادر تبدیل و تصحیح کی بھی، مثلاً موجودہ اڈیشن کے صفحہ ۲۹۵، سطر ۷، میں لکھنا چاہیے تھا کہ "یوروپی زبانوں کے تراجم قرآنی کی فہرست جو مذکورہ ماخذ کے دسویں اڈیشن کے مقدمے میں شامل کی گئی ہے"، نہ یہ کہ "فہرست تراجم قرآن، دسواں اڈیشن ۱۹۸۰ء" اور ظاہر ہے کہ یہ ماخذ اردو تراجم سے قطعاً غیر متعلق ہے۔

کتاب میں اس کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ ہر اردو ترجمے خاص کر پرانے ترجمے کے متعلق یہ بھی بیان کریں کہ وہ اب کہاں دیکھا جا سکتا ہے، اس سے ہمارے فاضل مولف کی انتھک کوشش، عظیم محنت اور اس اصول عمل کا پتہ چلتا ہے کہ محض سنی سنائی باتوں پر اکتفا نہ کریں۔

کتاب میں کوئی تین سو صفحے ہیں، اور ٹائپ پر خوبصورت چھپائی ہوئی ہے، جزاہ اللہ خیراً۔

سلمان رشدی کی دل آزار کتاب اور قومی پریس

از

حافظ عمیر الصدیق دریابادی ندوی رفیق دارالمصنفین

ان دنوں ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے صحافتی حلقوں میں ایک کتاب "سیٹنیک ورسز" موضوع گفتگو ہے، یہ برطانیہ میں مقیم ایک کشمیری نژاد سلمان رشدی کا ناول ہے جس میں انتہائی گستاخی و دریدہ دہنی سے حضرت سیدنا ابراہیمؑ، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، امہات المومنینؓ اور حضرات صحابہ کرامؓ کے متعلق رائے زنی کی گئی ہے۔

ہر ایسی تحریر جو شرافت و شائستگی سے عاری اور عام اخلاقی اصولوں سے خالی ہو، وہ پاکیزہ حساس اور باضمیر ادیبوں کے لئے اذیت ناک، ناقابل برداشت اور تکلیف دہ ہے۔

مگر مستشرقین اور ان کے استشراق زدہ شاگردوں (جن کے لئے مستغربین کی اصطلاح اب معروف ہے) کی یہ تحریریں علمی دنیا کے لئے نئی اور انوکھی نہیں ہیں۔ ان کے قلم سے صلیبی جنگوں کا سلسلہ بدستور قائم ہے جس کا مظاہرہ علم، تحقیق، تاریخ، ادب اور ثقافت کے نام سے کیا جا رہا ہے۔ تاہم کسی نام کے مسلمان سے بھی ایسی ناروا جسارت کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی مگر اس نام نہاد مسلمان نے کتاب کا نام مشہور مستشرق مانٹگمری واٹ کی ایک تعبیر سے مستعار لیا اور ایک برطانوی پبلشر سے بطور رائلٹی ۸۵۰,۰۰۰ پونڈ یعنی تقریباً دو کروڑ چار لاکھ روپے میں ایمان کا سودا کر بیٹھا فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ

اس کتاب سے مسلمانوں کے جذبات کو جو شدید اذیت پہنچی ہے وہ بالکل قدرتی ہے، انبیائے کرامؑ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے آل و اصحابؓ کی محبت ان کے ایمان کا جزء ہے، ان کی بارگاہ میں مال و متاع اعزہ و اقربا، اور دنیا کی عزیز ترین شے اور بیش قیمت متاع کو قربان کر دینا، کسی بھی مسلمان کے لئے باعث ثواب اور سرمایۂ سعادت ہے

اے شہ دیں ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

حکومت ہند کا یہ اقدام لائق شکریہ ہے کہ اس نے مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ کیا، اور اس ملک میں اس کی خرید و فروخت اور طباعت و اشاعت پر پابندی عائد کر دی، بہتر ہوتا کہ مغربی تعلیم کے علمبردار بھی اس مصنف کی بیہودہ گوئی اور ہرزہ سرائی کی مذمت کرتے، مگر افسوس ہے کہ قومی پریس خصوصاً ہمارے بڑے انگریزی اخبارات اور بعض معروف غیر مسلم اہل قلم نے اس کتاب کی تحسین کی ہے۔

خوشونت سنگھ جیسے معتدل مزاج صحافی بزرگ نے یہ اقرار تو کیا کہ اس کتاب کے بعض حصوں سے مسلمانوں کی دل شکنی ہوگی مگر انھوں نے بھی آئی، کے گجرال، نکھل چکرورتی اور نہال سنگھ وغیرہ جیسے لوگوں کی ہم نوائی میں، اظہار رائے کی آزادی کی بنیاد پر اس پابندی کو غیر مناسب قرار دیا، تاہم اس نقار خانہ میں چند آوازیں ایسی بھی سنی گئیں جو مسلمانوں کے لئے موجب تسکین ہیں، چنانچہ بمبئی کے بعض غیر مسلم ادیبوں اور دانشوروں جیسے جے، پی ڈی، کنشٹ نیزم ازاکیل، جین کالگٹکر، ورندا نابر، واسکر نندی، وسنتی رمن اور آشیم رائے وغیرہ نے اس کتاب کی سخت مذمت کی اور اس پر عائد پابندی کی حمایت کی اور اسے ضروری بتایا۔ مشہور اور اہم انگریزی اخبارات کے بعض مسلمان صحافی جو مسلمانوں کے ملی مسائل کو

عموماً "بنیاد پرستی" کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں، انھوں نے بھی اس کتاب کی زہرناکی کو محسوس کیا، مثلاً سید نقوی نے لکھا کہ اگر سلمان رشدی برطانیہ کے بجائے آئرلینڈ میں ہوتے جہاں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک فرقے برسرپیکار ہیں اور وہاں وہ ان دونوں میں سے کسی کا تمسخر و استہزاء کرتے اور ان کی مذہبی شخصیتوں کی جنسی زندگی کی خیالی شبیہ سازی کرتے تو ظاہر ہے کہ اس کا انجام کیا ہوتا۔ لیکن قومی پریس میں ایسی تحریریں شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آئیں ورنہ عام طور سے اداریوں، مضامین اور مراسلوں اور خبروں کے صفحات میں جگہ دے کر یہ تاثر عام کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ گویا اظہار رائے کی حریت، مطالعہ کی آزادی اور حقِ تصنیف پر یہ پابندی پہلی بار عائد کی گئی ہے۔ ٹائمز آف انڈیا کے ایک مضمون میں راجیو دھون نے کتابوں پر پابندی لگانے کے حق کے خلاف لکھتے ہوئے ان چند اہم کتابوں کی نشاندہی کی ہے جن پر آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد پابندی لگائی جا چکی ہے، ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

ہندو ہیون: میکس ویلی ۳۴ء، مدر انڈیا: کیتھرن مایو ۳۶ء، دی لینڈ آف دی لنگم: آرتھر مائلز ۳۷ء، مسٹیریس انڈیا: موکی سنگھ ۴۰ء، اینتھروپولوجی آف سکس لائف ۴۶ء، برٹینیا اینڈ ایو، شمارہ جولائی ۴۶ء، خدیجہ دی فرسٹ اینڈ ڈیووٹیڈ وائف آف محمد: ایف ماٹلنیا ۴۶ء،

آزادی کے بعد بھی ایسی کتابوں پر پابندی لگائی جاتی رہی ہے جن کا تعلق بین الاقوامی سیاست، فحش نگاری، جنسیات اور مذہبی منافرت وغیرہ سے تھا، کتابوں کے علاوہ رسائل اور کتابچے بھی اس فہرست میں داخل ہیں، مثلاً ۴۹ء میں نیوٹرل اوپینین اینڈ دی کشمیر ڈسپیوٹ، ۵۲ء میں پس منظر و پیش منظر سینسر فائر، خاک اور خون،

چندر موہنی اور محمد کرسومنات پر اور ۵۴ء میں اردو اخبار ہمارا کشمیر اور صلاح الدین کے کتابچہ امریکن ایڈ ٹو پاکستان پر قدغن لگی، ۵۵ء میں رابرٹ ٹیلر کی ڈارک ارج اور دیاٹ ریلیجن ہینز ڈن فار مین کائنڈ کو ہندوستان میں آنے سے روک دیا گیا، ۵۶ء میں آبری مے نن کی دی رامائن اور ۵۸ء میں الیگزینڈر کامپبل کی ہارٹ آف انڈیا پر پابندی کا قانون نافذ ہوا، ۶۲ء میں اسٹینلے والپرٹ کی نائن آور ٹو راما، ۶۳ء میں کرنٹ گریش کی عالگنہ، ۶۹ء میں الفریڈیلی رے کی دی ریویوشن آف دی برٹش ایمپائر، ۷۰ء میں اسٹرگل ٹبوین ٹولائنز اور گریولی وین کی مین فرام ماسکو اور ہیری ولیم کی میکنگ دی ماڈرن ورلڈ پر حد لگی، ۷۰ء میں ایمن لارنس کی جاپانیز فارن ریلیشن سنس ۱۹۴۹ء زد میں آئی، ایمرجنسی سے دو مہینہ قبل مذہبی جذبات کی پاسداری میں ڈیسمنڈ اسٹیورا کی اولی اسلام پر پابندی لگا دی گئی، ایمرجنسی کے دوران مائیکل ایڈورڈ کی پولیٹیکل بائیوگرافی آف نہرو (۷۵ء) اور چارلس بیٹل ہیم کی انڈیا انڈیپنڈنٹ (۷۶ء) کو ممنوع قرار دیا گیا۔

جن غیر ملکی اخبارات و رسائل پر وقتاً فوقتاً پابندی لگائی جاتی رہی ان میں سے کچھ یہ ہیں: پیکنگ ریویو ۶۲ء، دیس بھانی، روزنامہ جنگ، پرتگیزی بلیٹن نوٹی کیاس، کودین نیو شائی اور رامنظر ۶۳ء، انگولا کا نوٹیکا اور مکاؤ کا نوٹیکا ڈی مکاؤ ۶۶ء، سیلون کا ایوروڈ، ہانگ کانگ کا ہورینرن، پیرس کا ریویوشن، سیلون اور چین کا دی کال، آسٹریلیا کا دی وین گارڈ اور لندن کا پنجابی ہفتہ وار للکار ۷۱ء،

بعض کتابیں ایسی بھی تھیں جن کے ہندوستان سے باہر جانے پر پابندی لگائی گئی، مثلاً ۷۲ء میں ایس ایم بالاسور کی کتاب ماسکو ہینڈان انڈیا پر یہ حکم نافذ ہوا کہ یہ ہندوستان سے باہر نہیں جا سکتی۔

مذکورہ بالا کتابوں پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندو ہیون، مدر انڈیا، دی لینڈ آف دی لنگم، مسٹریس انڈیا، خائن آور ٹورا ماکے علاوہ آبری ے نن کی راما ی ٹولڈ، آرتھر کونسلر کی لوٹس اینڈ دی روبوٹ، اسے بھارتی کی دی آکر روب THE OCHRE ROBE وغیرہ ہندوؤں کے مذہبی جذبات کی رعایت ایس قابل گرفت ہوئیں، لیکن حکومت اور قانون کی اس مصلحت پر ہمارے قومی پریس نے اظہار رائے کی آزادی اور مطالعہ وکتب بینی کے فلسفہ سے صرف نظر کیا، مگر ایک ایسی کتاب جو دنیا کے تمام مسلمانوں کے لئے باعث کرب و اذیت ہے اور پوری دنیائے انسانیت کے لئے شرم کا سبب ہے، افسوس ہے کہ اس کی حمایت میں ہمارا یہ قومی پریس اس قدر سرگرم ہے کہ حکومت کے قانون کو ہی بدل دینے کی آواز بلند کر رہا ہے اس کے اس حیرت انگیز رویہ پر سب سے بڑی آسمانی کتاب کے بلیغ ترین اسلوب میں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ

أَمْ تَأْمُرُهُمْ أَحْلَامُهُم بِهَٰذَا أَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُونَ

سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

آج سے ، سال پہلے فروری ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن مرحوم کی تحریک سے اور پھر ان ہی کے اہتمام میں دار المصنفین میں جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا، اس کے سلسلہ میں دار المصنفین نے سیرۃ النبی، سیر الصحابہ، تابعین، تبع تابعین و محدثین کے علاوہ اسی موضوع سے متعلق ایک نیا سلسلہ شروع کیا جس کی اب تک پانچ جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور چھٹی زیر طبع ہے اور اسی پر یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

قیمت علی الترتیب ۳۰، ۳۲، ۳۲، ۳۲، ۲۰ "منیجر"

مطبوعات جدیدہ

خاتونِ اسلام مرتبہ مولانا وحید الدین خاں صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت نہایت عمدہ، صفحات ۲۰۰، مع ڈسک کور، قیمت ۳۵ روپیے، پتہ، مکتبہ الرسالہ سی ۲۹، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی۔

مولانا وحید الدین خانصاحب کو عصری اسلوب میں نئے دور کے تقاضوں کے مطابق اسلامی مسائل پر سلیس و شگفتہ زبان میں کتابیں اور مضامین لکھنے کا بڑا ملکہ ہے، وہ اپنے مدعا کو واضح کرنے کے لیے موقع و محل کے مطابق مناسب واقعات اور موزوں مثالیں پیش کر کے اور ذاتی تجربات و مشاہدات بیان کر کے اپنی تحریر کو بڑی دلنشین، موثر اور دلکش بنا دیتے ہیں جس کا نمونہ یہ کتاب بھی ہے جو ایک عام موضوع پر ہونے کے باوجود مصنف کے سلیقہ حسن ترتیب اور رعنائی بیان کی وجہ سے منفرد انداز کی ہو گئی ہے، اس میں تفصیل سے بتایا ہے کہ اسلام میں عورت کا درجہ و مرتبہ کیا ہے اور وہ کس قدر فطرت اور عورت کے مزاج و خصوصیت سے ہم آہنگ ہے، جدید تہذیب نے اس کو کیا درجہ دیا ہے اور وہ کس قدر ناقص، پر خطر اور نظام فطرت نیز عورت کی خلقت و طبیعت کے خلاف ہے، مصنف نے بہت مدلل طور پر ثابت کیا ہے کہ اسلام کا بخشا ہوا درجہ ہی عورت کے مزاج کے مطابق اور معاشرت و تمدن کے لیے خیر و خوبی کا ضامن ہے، اس کے مقابلہ میں جدید مغربی تہذیب نے اسے جو حیثیت دی ہے یا جسے دینا چاہتی ہے،

وہ ہوا تو بالکل غیر فطری اور عورت کے مزاج و مذاق کے سراسر خلاف ہے، ثانیاً یہ درجہ دینے میں جدید تہذیب بالکل ناکام رہی ہے اور ثالثاً یہ کہ اس کے نتیجہ میں گوناگوں خرابیاں اور تباہیاں رونما ہو رہی ہیں اور معاشرہ میں مختلف پہلوؤں سے بڑی ناہمواری، عدم توازن اور انتشار پیدا ہو رہا ہے، کتاب کے پہلے باب میں جہاں اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ "اسلام نے عورت کو حقیر درجہ دیا ہے" وہاں مغربی مرد و زن میں مساوات اور یکسانیت کا جو تصور پیش کیا ہے اس کو غلط اور تباہ کن ثابت کیا ہے، دوسرے باب میں کتاب و سنت میں بیان کیے گئے عورتوں کے امتیازات و خصوصیات اور انکے درجہ و مرتبہ کا ذکر ہے، تیسرے باب میں زوجین کے حقوق، نکاح و طلاق، جہیز، مہر اور پردہ وغیرہ کے احکام تحریر کیے گئے ہیں، لیکن اس سلسلہ میں بعض آیتوں کی تشریح محل نظر ہے، کہیں کہیں مباحث میں تکرار بھی ہے، مصنف کی حیثیت داعی کی ہے، داعی کے لیے خودستائی اور اپنی فضیلت کے اظہار سے پرہیز لازمی ہے، ایک جگہ اپنی والدہ کے محامد بیان کرتے ہوئے حضرت اسماءؓ بنت ابی بکرؓ کا جس انداز سے تذکرہ کیا ہے وہ ادب ناشناسی ہے،

سیرت شیخ الاسلام (حصہ اول) — مرتبہ مولانا نجم الدین صاحب اصلاحی تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۳۶۰ مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت ۳۵ روپیے، پتہ مکتبہ دینیہ، دیوبند، سہارنپور،

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سلف صالحین کی یادگار اور اسلام کی جیتی جاگتی تصویر تھے، ان کی ذات زہد و سیاست اور شریعت و طریقت کی جامع تھی، ان سے ہزاروں نفوس کو رشد و ہدایت نصیب ہوئی، اس لیے ان کی مفصل و مبسوط سوانح عمری کا اشتیاق قدردانوں کو عرصہ سے تھا، مولانا نجم الدین اصلاحی سے زیادہ ان کا واقف کار اور اس کام کا اہل کون ہو سکتا ہے؟ وہ حضرت کے خاص فیض یافتہ اور مسترشد ہونے کے علاوہ ان کے علوم و معارف کے شارح

و ترجمان بھی ہیں، اس سے پہلے انکے اصلاحی، دعوتی اور عارفانہ مکاتیب کو چار جلدوں میں جمع کرکے اپنے مفید حواشی کے ساتھ شایع کر چکے ہیں، حضرت سے گوناگوں خصوصیتوں اور غیر معمولی تعلق کی بنا پر انھوں نے یہ ذمہ داری بھی اپنے ذمہ لی اور محنت و جانفشانی سے اسے مکمل کیا، زیر نظر کتاب اس کا پہلا حصہ ہے، یہ تین ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں ولادت سے وفات تک کے حالات و واقعات درج ہیں، اس کا زیادہ حصہ خود حضرت مدنیؒ کی خود نوشت سوانحعمری "نقش حیات" سے ماخوذ ہے، دوسرا باب ان کے اخلاق و سیرت کا مرقع ہے جو بڑا سبق آموز ہے، کیونکہ حضرت کی پوری زندگی سے خلق محمدیؐ کا جلوہ اور اسوۂ صحابہ آشکارا تھا، تیسرے باب میں سلوک و تصوف پر بحث کی گئی ہے، مصنف نے یہ کتاب بڑی عقیدت سے لکھی ہے، اگر اس کی ترتیب مزید بہتر ہوتی تو اس کا فائدہ سوا ہو جاتا، مگر اس عمر میں مصنف کا یہ کتاب مرتب کرنا بھی ان کا کارنامہ اور انکی یا خود صاحب سوانح کی کرامت ہے، جس کیلئے حضرت مدنیؒ کے متوسلین کو خاص طور پر ان کا ممنون ہونا چاہیے۔

اردو کہاوتیں اور انکے سماجی و لسانی پہلو — مرتبہ ڈاکٹر یونس اگاسکر، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۳۳۶ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۸۰ روپیے، پتہ موڈرن پبلشنگ ہاؤس ۹ گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی،

ڈاکٹر یونس اگاسکر استاذ شعبہ اردو بمبئی یونیورسٹی مہاراشٹر کے ہونہار اور اچھے اہل قلم ہیں، اس کتاب میں انھوں نے اردو کہاوتوں اور ضرب الامثال کو موضوع بنا کر ان سے وابستہ تاریخی و تہذیبی حقائق و واقعات کا جائزہ لیا ہے اور انکی لسانی و ادبی اہمیت دکھائی ہے، یہ کتاب دراصل ان کا تحقیقی مقالہ ہے جو سات ابواب پر مشتمل ہے، شروع کے پانچ ابواب تمہیدی نوعیت کے ہیں، پہلے باب میں کہاوت کی تعریف، لفظی تحقیق اور ملکی و غیر ملکی زبانوں میں اس کے مترادف لفظوں پر

بحث کر کے اس کی اہم خصوصیات نمایاں کی ہیں، دوسرے باب میں ضرب الامثال کی سماجی، اخلاقی، تاریخی، لسانی اور فلسفیانہ اہمیت واضح کی گئی ہے، تیسرے باب میں کہاوت کے آغاز و ارتقا کی داستان بیان کی ہے، اس میں کہاوت کے وجود میں آنے کے اسباب و عوامل کا تذکرہ بھی ہے، چوتھے باب میں اس کی وسعت، ہمہ گیری اور عالمگیر مقبولیت کو واضح کرنے کے لیے اس کی قدامت اور مختلف زبانوں کے ادبیات میں اس کے رواج وغیرہ کا ذکر ہے، پانچویں باب میں اردو کہاوتوں کے ابتدائی نقوش کا سراغ لگانے کی کوشش کی گئی ہے، اس غرض سے صوفیائے کرام کے ملفوظات، دوہے، کبت اور اشعار نیز لوک کہانیوں کا جائزہ لیا ہے، چھٹے باب میں اردو کہاوتوں کے سماجی و معاشرتی پہلوؤں کی وضاحت کی گئی ہے، اس مقصد سے ہندوستان کے مختلف طبقوں، ذاتوں، پیشوں، سماجی رشتوں، زرعی معیشت، خورد و نوش کی اشیا اور ملبوسات وغیرہ کے تعلق سے رائج کہاوتوں کا جائزہ لیا گیا ہے، ساتویں باب میں اردو کہاوتوں کے لسانی پہلوؤں کا ذکر ہے، اس سے ان کی ادبی قدر و قیمت کا تعین بھی ہوتا ہے، آخرالذکر دونوں ابواب مقالہ کی جان اور بڑی اہمیت کے حامل ہیں، آخر میں ایک ضمیمہ ہے، اس میں اردو ضرب الامثال حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق جمع کیے گئے ہیں، لائق مرتب نے محاورہ، تلمیح اور روزمرہ وغیرہ سے کہاوتوں کو خلط ملط نہیں کیا ہے، اردو میں یہ اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے، آج کل کے سہولت پسند طلبہ و اساتذہ پامال اور آسان موضوعات ہی کو تحقیق کا موضوع بناتے ہیں، لیکن ڈاکٹر یونس اگاسکر نے اولاً تو ایک اہم اور انوکھے موضوع کا انتخاب کیا اور پھر پوری تلاش و جستجو سے کام لے کر اس کا حق ادا کیا، ان کی سعی و کاوش سے اردو کے ادبی و تحقیقی ذخیرہ میں ایک قابل قدر اور مفید کتاب کا اضافہ ہوا جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں، کتاب مواد و معلومات سے پُر ہے، اس سے ترتیب و بیان کی خوبی کے علاوہ مصنف کے اچھے تحریری ذوق و سلیقہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔

"ض"

جلد ۱۴۲ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۰۹ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۸ء عدد ۶

مضامین

مقالات

وفیات

باب التقریظ والانتقاد